قیمت : -/10 روپے

مارچ 2006

ماہ نامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

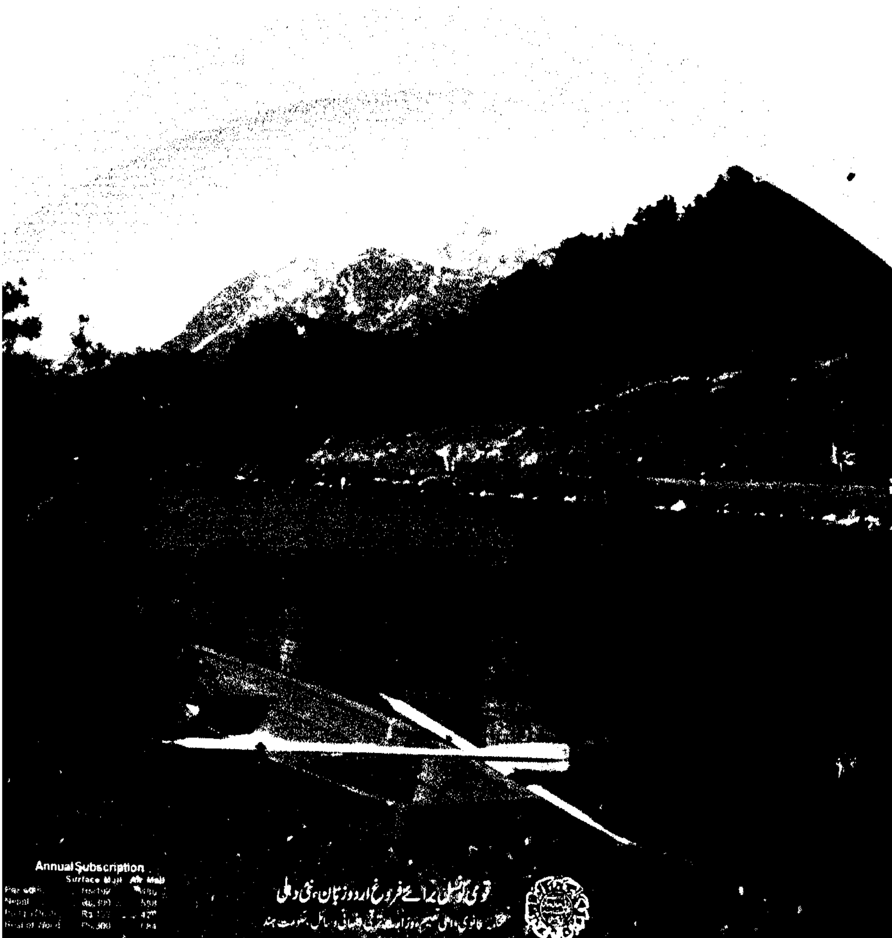

قومی اردو کونسل کا سالانہ اجلاس عام 2 فروری 2006 کو وزارت ترقی انسانی وسائل کے کمیٹی روم نمبر 112، سی ونگ، شاستری بھون میں منعقد ہوا جس کی صدارت مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل اور قومی اردو کونسل کے چیئر مین جناب ارجن سنگھ نے کی۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں کونسل کے وائس چیئر مین جناب شمس الرحمن فاروقی اور ڈائرکٹر جناب ایس. موہن کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

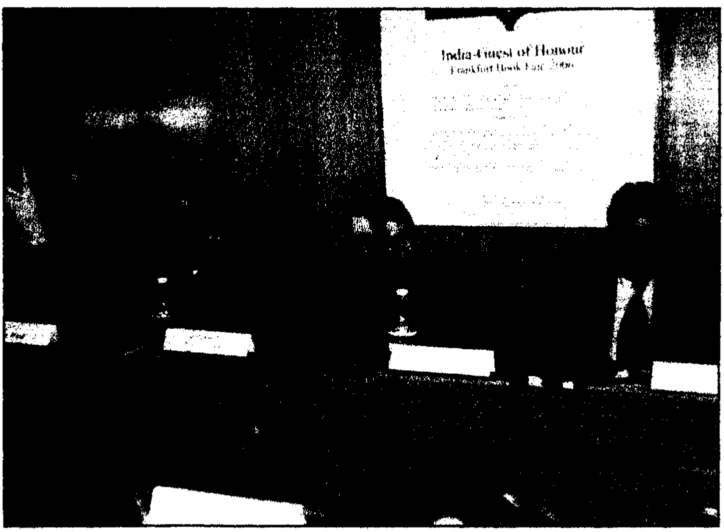

اسی موقعے پر لی گئی ایک اور تصویر میں پروفیسر قمر رئیس، جناب کمال فاروقی، جناب زبیر رضوی اور پروفیسر شمیم حنفی۔

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔8، شمارہ۔3 مارچ 2006

مدیر: ڈاکٹر آر۔کے۔ بھٹ

معاون مدیر: ڈاکٹر فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمۂ ثانوی واعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

کمپوزنگ: اسد نیاز، بہلول احمد
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی - 066 110
فون: 26103381, 26103938
26179657 فیکس: 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، چتر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات 2

ہماری بات 6

روبرو

- بیدار بخت سے گفتگو .... فیروز عالم 7
- شاہد حسن کمال سے گفتگو .... فیاض عالم 10

زبان اور تعلیم

- عہدِ طفلی اور ذاتی آزادی .... ساجدہ زیدی 12
- مہاراشٹر میں اردو تعلیم .... محمد حسن فاروقی 15

سائنس اور سماجیات

- پہلی ہندوستانی سائنس رپورٹ .... اسعد فیصل فاروقی 20
- حکم، میرے آقا .... اسپر دھا 22
- کم ہوتی بیٹیاں .... ناصرالدین 24

تاریخ

- اقتدار کی منتقلی .... مدن گوپال 28

ادب

- میر کلو کی گواہی .... انجم ماتپوری 41

ہماری مطبوعات سے

- غالب کی دلی (''یادہ بود غالب'' سے ماخوذ) .... خواجہ احمد فاروقی 44
- ہندجدید میں علمی نشاۃ الثانیہ اور قوم پرستی کا آغاز (''جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار'' سے ماخوذ) .... محمد ہاشم قدوائی 52

طلبہ کے لیے

- فارمیکوگنوسی میں کیریئر .... اے۔بی۔ڈی۔ سیلوم 57
- فنکشن اور اس کے مواقع .... ہنیت نیر، استوتی تریحان 59
- اردو زبان وادب (کوئز) .... فیاض عالم 62
- بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-32) .... محمد امتیاز عالم 65

اُردو خبرنامہ .... ادارہ 66

تبصرہ وتعارف .... کتابوں پر تبصرے 75

بچوں کا گوشہ

- اُلّو کی اداسی (''بھارت کی لوک کتھائیں'' سے ماخوذ) .... محمد قاسم صدیقی 80

آپ کی بات

■ **ابواللیث شمسی ــــ شعبۂ اردو، مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا (بہار)**

''اردو دنیا'' جنوری 2006 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ حسب سابق قابل تحسین ہے۔ خاص طور پر جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون ''اسکول کی تعلیم کے ذریعے ہندوستان میں اردو کی بقا کی حکمت عملی'' نہایت وقیع، معلوماتی اور اقتضائے حال کے عین موافق ہے۔ اس میں بے حد سنجیدہ امور اور اہم مسائل زیر بحث لائے گئے ہیں تاکہ نئی نسل کو اردو زبان و ادب کے ساتھ ہی ایک تہذیبی روایت سے روشناس کرایا جاسکے کیوں کہ درحقیقت اسی میں اردو کی بقا کا راز بھی مضمر ہے۔ علاوہ بریں اپنے مضمون میں فاروقی صاحب نے بار بار عملی اقدام کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے۔ کاش! ہم اردو والے ان کی باتوں پر سنجیدگی سے غور و فکر کریں اور ان پر عمل پیرا ہونے کی سعی کریں۔

''خط نستعلیق'' کے عنوان سے مغنی تبسم صاحب کا مضمون بھی دلچسپ اور معلوماتی ہے لیکن میرے خیال میں کچھ زیادہ ہی اختصار سے کام لیا گیا ہے جس سے کہیں کہیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ حکیم اشہر قدیر کے مضمون ''حکیم محمد کبیر الدین اور اردو'' کے توسط سے علم طب اور اردو سے متعلق مفید معلومات فراہم کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جے دیپ مجمدار کا مضمون ''اردو کے تئیں بنگالیوں کا بڑھتا رجحان'' بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

دیگر مشمولات جیسے ''ہندوستان کی خلائی کامیابیاں'' (اظہار اثر) اور ''زراعت کا مستقبل'' (بھرت جھن جھن والا) بھی بیش قیمت اور مفید ہیں۔ گوشۂ ادب کے تحت فرحت اللہ بیگ کا انشائیہ ''پٹنا'' اچھا لگا اور کملیشور کی کہانی ''آزادی مبارک'' میں آزادی کے جلو میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کا ایک المناک واقعہ فن کارانہ طور پر کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی سے شہاب ظفر اعظمی کی گفتگو میں بھی اردو زبان و ادب سے متعلق کئی بنیادی مسائل پیش کیے گئے ہیں، جو اہم بھی ہیں اور معلومات افزا بھی۔ اردو خبر نامہ، تبصرہ و تعارف اور بچوں کا گوشہ بھی دلچسپ ہے۔

■ **درخشاں زریں ــــ محلہ عماد پور، بہار شریف، نالندہ (بہار)**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ فروری 2006 نظر نواز ہوا۔ اس شمارے کے بعض مشمولات نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام نے ''اردو زبان کی تعلیم (بالغوں کے لیے ابتدائی سطح پر)'' میں اپنے مشاہدے کی بنا پر دوسری اور تیسری زبان کی حیثیت سے اردو زبان سیکھنے والوں کے درپیش مسائل اور ان کے ازالے کے لیے جو معتبر تجاویز پیش کی ہیں وہ واقعی قابل غور اور لائق توجہ ہیں۔ ان کی پیش کردہ گزارشات اردو اساتذہ کے لیے کافی اہم ہیں۔ امید کہ ان کی تجاویز پر قومی اردو کونسل اور اردو کے دیگر معتبر ادارے ضرور غور کریں گے تاکہ ان نوآموز طالب علموں کے لیے ایک دلچسپ نصاب، کارآمد کتابیں اور سافٹ ویئر تیار کیے جاسکیں۔ ''تدریس زبان اور نصاب کی تدوین'' کے سلسلے میں غلام نبی مومن نے جن مقاصد اور ضروریات پر روشنی ڈالی ہے وہ بھی اردو زبان کی تعلیم و تدریس کی جدید کاری کے لیے کافی مفید ہیں۔ 'صحت اور سائنس' میں کلدیپ شرما کے مضمون ''اسٹیم خلیوں کا کرشمہ'' کے مطالعے نے جدید سائنسی تحقیق سے روشناس کرایا۔ اس مضمون کا ترجمہ ڈاکٹر رئیس احمد نے جس سلیس اردو میں کیا ہے اس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ان مضامین سے قطع نظر اس شمارے میں شامل کوئز کا موضوع بھی کافی دلچسپ ہے۔ میں اس گوشے کا مطالعہ ہمیشہ بڑی دلچسپی سے کرتی ہوں لیکن اس بار کے موضوع نے مجھے خصوصاً اس بات کے لیے آمادہ کیا کہ میں بھی اس مقابلے میں شامل ہونے کی جسارت کروں۔

■ **اختر سندیلوی ــــ 34، فقیرا گنج، کٹرہ، الٰہ آباد (211022) یو. پی.**

''اردو دنیا'' پابندی سے پڑھتا ہوں۔ بصارت کی کمزوری کے باعث بعض مضامین ایک مرتبہ پڑھنے سے سیری نہیں ہوتی۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ جنوری کے شمارے میں فاروقی صاحب کا مضمون ''اسکول کی تعلیم کے ذریعے ہندوستان میں اردو کی بقا کی حکمت عملی'' دو تین بار پڑھا۔ فاروقی صاحب نے سارے زخم کھول کر دکھا دیے۔ خواہ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ہوں یا اندر کمار گجرال۔ اسی طرح کچھ دنوں پہلے گوپی ناتھ امن لکھنوی جو کہ اردو کے اعلیٰ ترین حامی سمجھے جاتے تھے، ان کو پنت جی نے کس طرح اعلیٰ عہدہ دے کر راستہ صاف کیا۔ ''سکوں کے عوض اردو کا سودا'' لکھ کر جناب رام پرکاش کپور نے اس پر پڑے ہوئے پردے کو ہٹایا اور ان کی سنجیدہ حق بیانی پر کافی شور مچا تو انھوں نے سعادت حسن منٹو مرحوم کا حوالہ دے کر اس بحث کو بند کیا۔ جناب کملیشور کی کہانی ''آزادی مبارک'' بھی کافی دلچسپ ہے۔ محمود احمد ہنر مرحوم نے ان کے متعلق کئی بار تذکرہ

کیا اور محمود احمد ہنر کی برسی کے موقع پر جناب خواجہ احمد عباس نے بھی ان کا ذکر خیر کیا کہ دوران مقدمہ الہ آباد میں قیام کے دنوں میں محمود احمد ہنر نے بہت سے ہندی کے ادیبوں سے ملاقات کرائی جن میں سے جناب کملیشور کا نام خاص طور پر لیا تھا کہ یہ ادیب مستقبل میں بہت ترقی کرے گا، یہ کہانی ان کی بات کا ثبوت ہے۔ جناب مغنی تبسم کا خط نستعلیق پر مضمون آج کے اردو کمپیوٹر کے کمپوزر اور پروف ریڈر صاحبان کے لیے بے حد مفید ہے وہ اس سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ جناب مدن گوپال کا ''ٹیپو سلطان کی شکست'' بھی بہت سے رموز سے آشنا کرتا ہے جو عام تاریخی کتابوں میں موجود نہیں۔ بچوں کے گوشے میں ''پانی کی قدر'' بہت سبق آموز کہانی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عام طور پر عوام موٹر لگا کر آس پاس کے لوگوں کے پائپ میں آنے والا پانی کھینچ کر اپنے دروازوں پر چھڑکاؤ کرنے میں بہت سا پانی ضائع کر دیتے ہیں جس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور دوسرے لوگ بوند بوند کو ترستے ہیں۔ پانی کی قدر و قیمت پہچاننے کے لیے یہ کہانی بہت اچھی ہے۔ کوئز کی بات ہی نرالی ہے اس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

بہر حال اتنی اچھی ترتیب اور انتخاب کے لیے مبارک باد قبول فرمائیے۔ دعا گو ہوں کہ ''اردو دنیا'' دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے۔

■ **رحمت بی۔ استاد۔ گورنمنٹ پرائمری گرلس اسکول، ملارنا ڈونگر، سوائی مادھو پور، راجستھان۔ 322028**

فروری 2006 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ عہد حاضر میں اردو تعلیم اور سماجی و سائنسی علوم کے تعلق سے آپ کا یہ جریدہ انفرادیت لیے ہوئے ہے۔ اس شمارے میں ''روبرو'' کے تحت چانگ شی شوان سے کی گئی ونود وارشنے کی گفتگو ہم سب اردو والوں کے لیے حوصلہ افزا ہے۔ روزنامہ 'ہندوستان' نئی دہلی میں شائع شدہ اس گفتگو کا ترجمہ فیاض عالم نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔

زبان اور تعلیم کے موضوع پر پیش کردہ مضامین میں ''تدریس زبان اور نصاب کی تدوین'' (غلام نبی مومن) اردو زبان کی تعلیم (بالغوں کے لیے ابتدائی سطح پر)''، (ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین) اور ''مادری زبان کی اہمیت و ضرورت'' (محمد محمود فیض آبادی) میں سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ماہرین تعلیم کو ان تجاویز پر غور کرنا چاہیے تاکہ اردو نظام تعلیم کو بہتر سے بہتر بنایا جا سکے۔ سائنسی مضامین میں ''قاتل فلو کی دستک'' (ڈاکٹر عبید الرحمٰن) اور ''اسٹیم خلیوں کا کرشمہ'' (کلدیپ شرما) سائنسی تعلیم کے نقطۂ نظر سے معلوماتی ہیں۔ کلدیپ شرما کے اس مضمون کا ترجمہ ڈاکٹر رئیس احمد نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ اس نوعیت کے مضامین اردو رسائل میں بہت ہی کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔

عبدالودود انصاری کا مضمون — ''معذور انسان کامیاب شخصیت'' سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ بصیرت افروز بھی ہے۔ بی اے ٹلکرنی کی مراٹھی کہانی کا ترجمہ — ''قاصد'' سلام بن رزاق نے کیا ہے جو بہت ہی خوب ہے۔ علاقائی زبانوں کے افسانوں اور کہانیوں کے تراجم شامل کرنا ''اردو دنیا'' کے دامن کو وسعت بخشنے کے مترادف ہے۔ ''عربی تنقید کے اہم مباحث'' پروفیسر ابوالکلام قاسمی کا ایک جامع مضمون ہے جو ان کی مشہور و معروف کتاب ''مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت'' سے ماخوذ ہے۔ ''اردو خبر نامہ'' اس رسالے کا ایک اہم حصہ ہے جس کے مطالعے سے اردو زبان و ادب کے حوالے سے ہونے والی سرگرمیوں سے واقفیت ہو جاتی ہے ساتھ ہی نئی نئی کتابوں کی اشاعت کا علم بھی ہو جاتا ہے۔ ''تبصرہ و تعارف'' میں بحیثیت مبصر محترم مخمور سعیدی، پروفیسر ظفر احمد نظامی اور پروفیسر تنویر احمد علوی نے متاثر کیا۔ بچوں کے گوشے میں پیش کی گئی کہانی ''فلسفی نوکر'' نہایت دلچسپ ہے۔ اس حسن انتخاب کے لیے مبارک باد قبول فرمائیں۔

■ **مولا بخش، شعبۂ اردو، دیال سنگھ کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی**

''اردو دنیا'' نے رسالوں کی دنیا میں اپنا اہم مقام بنالیا ہے۔ اس رسالے کی قرأت سے نئی نسل میں ایک خاص طرح کی بیداری آئی ہے۔ فروری 2006 میں 'چانگ شی شوان' سے کی گئی ونود وارشنے کی گفتگو کا ترجمہ فیاض عالم نے بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

ڈاکٹر خواجہ اکرام کا مضمون بالغوں کو اردو سکھانے کے سلسلے میں تدریس زبان کے جدید نظریے کے مطابق ہے۔ ان کا اشارہ بالغوں کے لیے ایک جدید آغاز کی تشکیل و اشاعت کی طرف ہے ایسے مضامین ضرور شائع جائیں۔ قارئین کے تاثرات کے بعد پھر نئے سرے سے غور و فکر بھی کیا جائے اور Language Lab پر مزید تفصیل سے لکھا جائے۔

محمد محمود فیض آبادی کو اس امر پر بھی غور کرنا تھا کہ مادری زبان کی آج تعریف کیا ہو سکتی ہے۔ اب جب کہ کثرت سے Inter-Cast شادیاں ہو رہی ہیں اور عورتیں چہار دیواری سے نکل کر زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بہ شانہ ہیں۔

برڈ فلو پر عبید الرحمٰن صاحب کا مضمون معلوم ہوتا ہے کہ کسی سائنسی علم سے واقفیت رکھنے والے اسکالر نے لکھا ہے، سائنسی معلومات کے لیے جس علمی نثر اور

روز مرہ کی ضرورت ہوتی ہے عبید صاحب اس سے واقف ہیں ورنہ آج کل تو سائنس پر لکھنے والے صرف لیبل لگا کر گھوم رہے ہیں۔ ان کے مضامین پڑھ کر غزل کا ذائقہ تازہ ہو جاتا ہے۔ کلدیپ شرما کے مضمون کا ترجمہ ڈاکٹر رئیس احمد نے باریکی سے کیا ہے۔ سلام بن رزاق نے مراٹھی کہانی کا ترجمہ بھی بہت اچھی طرح کیا ہے۔ مجھے مراٹھی آتی ہی نہیں تو میں کس منہ سے تعریف کروں البتہ اردو میں جو کچھ سامنے آیا ہے اس میں سلام بن رزاق کا اسلوب درآیا ہے۔ فیاض عالم کا کوئز بھی خوب ہے۔ دیگر مشمولات بھی قابل تعریف ہیں۔ اردو زبان کے نصاب اور تدریس وغیرہ پر مضامین بغیر سروے کے ایک ٹیبل ٹاک معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم لکھنے والوں کو مبارک باد دی جانی چاہیے۔ ''اردو خبرنامہ'' کے مطالعے سے بھی اردو دنیا کی سرگرمیوں کا علم ہوتا ہے

''کلیات میر'' مرتب ڈاکٹر احمد محفوظ پر تبصرہ مخمور سعیدی نے خوبصورتی سے کیا ہے۔ ''تاریخ ایجادات'' مبصر پروفیسر ظفر احمد نظامی، ''اردو کے ابتدائی معرکے'' مبصر عظیم امروہوی، ''کون عبث بدنام ہوا'' مبصر پروفیسر تنویر احمد علوی اور ''ریت پر خیمہ'' مبصر زبیر احمد بھاگلپوری کے مطالعے سے معلومات میں اضافہ ہوا اور کتابیں پڑھنے کا اشتیاق بیدار ہوا۔ ویسے تو آجکل کتابیں پڑھنے کی بجائے سونگھنے کا سلسلہ چل پڑا ہے۔

■ **ایم نسیم اعظمی —ڈومن پورہ، کساری، مئوناتھ بھنجن (یو. پی.)**

ماہنامہ ''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ بابت ماہ فروری 2006 باصرہ نواز ہوا۔ رسالہ حسب سابق صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے معیاری، وقیع اور معلوماتی ہے۔ خصوصاً قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ساتویں کل ہند اردو کتاب میلے کی روداد سے واقفیت ہوئی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا یہ اقدام سب سے زیادہ اہم اور قابل ستائش رہا ہے کیونکہ اس قسم کے کتابی میلوں نے اردو قارئین اور کتابوں کو قریب کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اتر پردیش کے صدر مقام اور لسانی وتہذیبی مرکز لکھنؤ میں ساتویں کل ہند کتابی میلے کے انعقاد کے لیے جہاں کونسل کے ذمے داران خصوصاً محترم شمس الرحمٰن فاروقی (وائس چیئرمین) اور ڈائرکٹر صاحب قابل مبارک باد ہیں، وہیں اتر پردیش اردو اکادمی کے صدر ملک زادہ منظور احمد اور دوسرے ذمے داران بھی قابل ستائش ہیں کہ ان حضرات کی کوششوں سے یہ کتابی میلہ بھی بحسن وخوبی انجام پذیر ہونے میں کامیاب ہو سکا۔ بہتر ہوتا کہ اس قسم کا اگلا کتابی میلہ مشرقی اتر دیش خصوصاً مئوناتھ بھنجن یا اعظم گڑھ میں بھی منعقد کیا جاتا تاکہ مشرقی اتر پردیش کے اس وسیع اردو حلقے میں بھی اردو قارئین اور اردو کی کتابوں کو ایک ساتھ جمع ہونے کا موقع مل سکے۔

زیر نظر شمارے میں اردو کے معروف چینی شاعر چانگ شی شوان (انتخاب عالم) سے گفتگو خوب ہے مگر تشنگی کا احساس دلاتی ہے۔ ''تدریس زبان اور نصاب کی تدوین'' غلام نبی مومن کا اپنے موضوع کے لحاظ سے اچھا مضمون ہے۔ غلام نبی مومن مہاراشٹر کے نصابی محکمے سے کافی دنوں سے وابستہ ہیں اور ہندوستان بھر کے نصابی وتدریسی مسائل کا بخوبی ادراک رکھتے ہیں اس لیے وہ تدریس ونصاب سے متعلق جو کچھ بھی لکھتے یا کہتے ہیں وہ کافی مستند اور باوزن ہوتا ہے۔ ''مادری زبان کی اہمیت وضرورت'' از محمد محمود فیض آبادی اور ''اردو تھیسارس'' از شہاب الدین انصاری اچھی اور معلوماتی نگارشات ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر سارے مشمولات اور مستقل کالم بھی خوب اور کارآمد ہیں۔ ''اردو دنیا'' اردو قارئین، طلبہ اور اساتذہ کے لیے انتہائی کارآمد جریدے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ مگر اب بھی وسیع پیانے پر اردو قارئین، طلبہ اور اساتذہ سے متعارف کرانے کی ضرورت ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اردو دنیا سے مستفیض ہونے کا موقع مل سکے اور رسالے کی اشاعت میں بھی قابل لحاظ اضافہ ہو سکے۔

■ **م.ق. سلیم۔ ''سائبان'' 469-2-19، بیرون فتح دروازہ، حیدرآباد۔**

''اردو دنیا'' فروری 2006 صوری اور معنوی اعتبار سے ایک مکمل پرچہ ہے۔ آج کے اس انفارمیشن ٹکنالوجی کے دور میں پرنٹ میڈیا کی اہمیت بہ ظاہر کم ہو رہی ہے۔ مگر قومی اردو کونسل اردو زبان کے لیے جو کام کر رہی ہے وہ ہندوستان بھر کی اردو اکادمیوں، اردو انجمنوں اور اردو اداروں کے لیے قابل تقلید ہے۔ متذکرہ اداروں نے اپنی سرگرمیاں صرف انعامات دینے، ایوارڈ دینے یا پھر ادبی اجلاسوں کے انعقاد تک محدود کر رکھی ہیں۔ کلاسیکی ادب کے ساتھ تاریخ، جغرافیہ، سماجیات، ادب اطفال اور خاص طور پر دوسری کتابوں کی اشاعت کونسل کا اہم کارنامہ ہے۔ کتاب میلوں میں لاکھوں روپے کی اردو کتابوں کی فروخت اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو ابھی زندہ ہے۔

تدریس زبان اور نصاب کی تدوین پر غلام نبی مومن کا بڑا اچھا مضمون ہے۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام کا مضمون ''اردو زبان کی تعلیم (بالغوں کے لیے ابتدائی سطح پر)'' بہتر تجزیہ ہے۔

□□□

ہماری بات

ہندوستان کی آزادی کو 59 برس گزر چکے ہیں اور ان چھ دہائیوں میں ہمارے ملک نے ہر میدان میں خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ زراعت، صنعت و حرفت، سائنس اور ٹیکنالوجی، تعلیم، صحت، مواصلات، ذرائع نقل و حمل، عوامی ذرائع ابلاغ غرض ہر شعبے میں ہماری کارکردگی بہتر رہی ہے۔ لیکن اگر ہمیں ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہونا ہے تو اس کے لیے ترقی کی رفتار میں مزید تیزی لانی ہوگی۔ وسائل انسانی کا موزوں اور مناسب استعمال، بہتر حکمت عملی، خلوص نیت اور اپنی منزل کے حصول کے صالح جذبے کے ساتھ آگے بڑھ کر ہی ہمیں اپنے مقاصد میں کامیابی مل سکتی ہے۔ ملک کے 57 ویں جشن جمہوریت کے موقعے پر صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام نے قوم کے نام اپنے خطاب میں جن خیالات کا اظہار کیا اور جن اہم امور پر توجہ دلائی، اگر ہم ان پر سنجیدگی سے عمل کریں تو بہت جلد ہمارا ملک خوش حال اور ترقی یافتہ ہو سکے گا۔ انھوں نے کہا کہ آج ہمارے سامنے دو بنیادی ضرورتیں ہیں۔ ایک کا تعلق ملک اور قوم کی ترقی سے ہے اور دوسری اس ترقی کو برقرار رکھنا اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار کے مواقع فراہم کرانا ہے تاکہ ہندوستانی عوام کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے اور ان کا معیار زندگی بہتر ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم سخت محنت کریں اور اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں اپنی اخلاقی قدروں کی پاسداری بھی کریں۔ اس کے بغیر ہماری ترقی کھوکھلی ثابت ہوگی۔ یہ اس صورت میں خاص طور سے اہم ہے جب ملک کو 54 کروڑ نوجوانوں کی قیادت کرنی ہے جو 2020 سے بہت پہلے ہمارے ملک کو ایک ترقی یافتہ ملک بنانے کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا سب سے طاقتور اور موثر ذریعہ ہیں۔

ملک کی نئی نسل کی تعلیم کے لیے ابتدائی سے لے کر اعلیٰ سطح تک مختلف تعلیمی ادارے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر چلائے جا رہے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں تدریس کے نئے طریقوں کا استعمال کیا جائے اور جدید علوم خصوصاً کمپیوٹر سے تمام طلبہ کو واقف کرایا جائے۔ ملک کی تین قدیم یونیورسٹیوں مدراس، ممبئی اور کولکاتہ نے مشترکہ طور پر پہلی ورچول یونیورسٹی (Virtual University) قائم کی ہے جس کا افتتاح گذشتہ دنوں صدر جمہوریہ نے کیا اور ایجوسیٹ (ایجوکیشن سٹیلائٹ) کے ورچول ٹیلی ایجوکیشن ڈلیوری سسٹم کے ذریعے ملک کے مختلف گوشوں میں پہلے 15 ہزار طلبہ سے رابطہ قائم کیا۔ ورچول یونیورسٹی کا مطلب ہے جغرافیائی اور انتظامی حدود کو توڑتے ہوئے بہترین اور معیاری تعلیم کی فراہمی۔ یہ ہماری ذمے داری ہے کہ اسے نئے ماحول میں متعارف کرائیں اور زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو اس سے استفادہ کرنے کی ترغیب دیں۔

آج نئے زمانے کی نئی سوغاتوں سے ہمارے دیہی علاقے بھی بہرہ ور ہونے لگے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ ہماری پانچ ہزار سالہ قدیم تہذیب و ثقافت نئی ٹیکنالوجی اور ترقی سے ہم آہنگ ہو رہی ہے۔ اس عمل کو مزید مستحکم اور موثر بنانے کے لیے سائنسدانوں، تکنیکی ماہرین اور حفظان صحت کے ماہرین کو ایک اہم کردار ادا کرنا ہوگا اور اپنے اپنے میدان میں اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔

ہر بیداری اور نئی تبدیلی اپنے ساتھ کچھ ذمے داریاں لاتی ہے اور کچھ قواعد و ضوابط کی بھی متقاضی ہوتی ہے اس لیے ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کو فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارے خوابوں کو حقیقت بنانے والوں میں خوداعتمادی پیدا کی جا سکے اور کروڑوں عوام کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر سکے۔

صدر جمہوریہ نے اپنے خطاب میں شفافیت کو ایک اعلیٰ قدر قرار دیتے ہوئے زندگی کے ہر موڑ پر اس پر عمل کرنے کا درس دیا۔ انھوں نے بتایا کہ گذشتہ 21 نومبر کو انھوں نے ادھی چنچا نگری متھ میں ایک تقریب میں شرکت کی۔ وہاں دسویں جماعت کے ایک طالب علم نے ان سے یہ سوال کیا کہ ہمارے ملک میں کینسر کی طرح جڑ پھیلا چکی بدعنوانیوں کو روکنے میں طلبہ کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ انھوں نے اسے جواب دیا "ایک ارب کی آبادی والے ہمارے ملک میں عام طور سے اکثریت اچھے لوگوں کی ہے۔ اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کچھ لوگ شفاف نہیں ہیں اور ملک کے قوانین کی پابندی نہیں کر رہے ہیں تو ہم کیا کریں؟ ان تمام گھروں میں والدین کے علاوہ ایک لڑکا یا ایک لڑکی یا دونوں ضرور ہوں گے۔ اگر ان گھروں میں والدین شفافیت کے راستے سے بھٹک گئے ہیں تو بچے اپنی محبت کو وسیلہ بنا کر انھیں راہ راست پر لا سکتے ہیں۔" انھوں نے بچوں سے پوچھا کہ کیا وہ اپنے والدین سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں وہ صحیح نہیں ہے۔ زیادہ تر بچوں نے فوراً جواب دیا کہ وہ بالکل ایسا ہی کریں گے۔ اس موقعے پر بچوں نے حلف لیا کہ "میں بدعنوانی سے پاک رہ کر ایمانداری کی زندگی

گزاروں گا اور دوسروں کے لیے مثال پیش کروں گا کہ وہ بھی ایک شفاف زندگی گزاریں۔''

یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ ہندوستان ایک کثیر مذہبی، کثیر لسانی، کثیر ثقافتی اور دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے۔ اس ملک کے عوام انتخابات میں سوچ سمجھ کر اور اپنے ضمیر کی آواز پر جوش و خروش سے حق رائے دہی کا استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے عوام کو ایک ترقی یافتہ ملک میں رہنے کا حق ہے اور اس کے لیے ترقیاتی سیاست کی ضرورت ہے۔ صدر جمہوریہ نے اپنے خطاب میں ترقیاتی سیاست کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ دراصل سیاست کے دو پہلو ہیں: سیاسیاتی سیاست اور ترقیاتی سیاست۔ اول الذکر کی ضرورت انتخابی عمل کے دوران پڑتی ہے۔ اس کے فوراً بعد تمام سیاسی جماعتوں کو ایک مشترکہ مشن کے ساتھ ترقیاتی سیاست کی جانب رجوع کرنا چاہیے۔ اس پر عمل کرتے ہوئے خط افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والے ملک کے کروڑوں عوام کو اوپر اٹھانے اور ناخواندگی اور بے روزگاری ختم کرنے کے لیے تمام سیاسی جماعتوں کو مل کر کام کرنا چاہیے۔

ہمارے ملک میں آج بھی ایسے بہت سے گھر ہیں جہاں لوگ بچوں کو اسکول بھیجنے کی بجائے کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ تعلیمی عمل سے وابستہ افراد کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ان بچوں کے مستقبل کو تاریک ہونے سے بچائیں اور انھیں تعلیم کی اہمیت و افادیت سے واقف کرائیں اور والدین کو آمادہ کریں کہ وہ اپنے بچوں کو اسکول بھیجیں۔ اسی طرح ہمارے ملک کے رہنماؤں کی بھی یہ ذمے داری ہے کہ وہ ان لوگوں تک پہنچیں جنھیں ان کی مدد کی اشد ضرورت ہے۔

آج وقت کا اہم تقاضا ہے کہ ملک کے تمام شہری نظم و ضبط اختیار کریں۔ یہ عمل روشن خیال شہری پیدا کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوگا۔ کوئی بھی ملک اپنے شہریوں سے عظیم بنتا ہے۔ ان کی اخلاقیات، ان کے اقدار اور کردار میں ملک منعکس ہوتا ہے۔ اس بات کا انحصار انھی پر ہے کہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن رہے گا یا جمود کا شکار ہو جائے گا۔ ملک کو خوش حال اور ترقی یافتہ بنانے کے لیے ہم تمام لوگوں کو ایمانداری، سچائی، خلوص اور رواداری کو اپنی روزمرہ زندگی کا حصہ بنانا ہوگا اور ملک کی ترقی کے لیے حسب استطاعت اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

□□□

حالی

مصنفہ: صالحہ عابد حسین

ایک شاعر، ادیب، نقاد، سوانح نگار کے ساتھ ساتھ مولانا الطاف حسین حالی ایک سماجی مصلح بھی تھے۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اصلاح کے لیے شاعری کا سہارا لیا بلکہ شعر و ادب کی کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی اور اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق کی ترغیب دی۔ صالحہ عابد حسین نے حالی کی شخصیت اور زندگی کے تمام گوشے اس کتاب میں اجاگر کیے ہیں۔

صفحات: 68، قیمت -/15 روپے

محمد حسین آزاد

مصنف: نند کشور وکرم

محمد حسین آزاد ہمارے ان اکابرین میں سے ہیں جنھوں نے اردو کی ادبی تاریخ کا رخ موڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ انجمن پنجاب کے ذریعے انھوں نے جدید نظم کو فروغ دینے کے ساتھ آب حیات، دربار اکبری، نیرنگ خیال اور سخندان فارس جیسی اہم کتابیں بھی لکھیں۔ نند کشور وکرم نے اس کتاب میں آزاد کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 79، قیمت: -/18 روپے

اقبال کی کہانی

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال وہ عظیم شاعر اور فلسفی ہے جسے عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شگفتہ مزاج انسان بھی تھے۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں سے بڑے باریک نکتے، اسرار اور لطیفوں کے چمن زار کھلتے تھے۔ اقبال کو اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ بھی تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے مضامین لکھے اور خوب صورت نظمیں کہیں جنھیں پڑھ کر بچے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اس کتاب میں اقبال کا جامع تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/11 روپے

جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن

مصنف: ظفر محمود

جوش ملیح آبادی اردو شعر و ادب کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے نہ صرف شاعری کو خوب صورت زبان عطا کی بلکہ نثر میں بھی گل کاری کی ہے۔ ان کے شعر و ادب کے مطالعے سے خود اعتمادی، جوش اور اپنے ملک و تہذیب کی بقا کے لیے سینہ سپر ہونے کا پیغام ملتا ہے۔ نہ صرف ان کا فن بلکہ خود شاعر کی زندگی کے حالات اس پیغام کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ ظفر محمود نے ''جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن'' میں شاعر کی زندگی اور فن کے انھی گوشوں کو اجاگر کیا ہے جن سے نئی نسل کی ذہنی و علمی تربیت ہوتی ہے۔

صفحات: 105، قیمت -/38 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

فیروز عالم

بیدار بخت سے گفتگو

جناب بیدار بخت کا شمار عصر حاضر کے اہم مترجمین میں ہوتا ہے۔ آپ نے اردو اور فارسی کے علاوہ سنسکرت ادب کا ترجمہ بھی انگریزی میں کیا ہے۔ آپ 1940 میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ 1947 میں والدین پاکستان چلے گئے۔ لیکن آپ کسی وجہ سے اپنے دادا اور چچا کے ساتھ دلّی رہ گئے۔ چچا سکندر بخت قومی رہنما تھے۔ 1956 میں تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے۔ 1962 میں سول انجینئرنگ کی ڈگری لی۔ 1966 میں انگلستان پہنچے، وہاں سے انجینئرنگ میں پوسٹ گریجویشن کیا۔ بعد میں لندن یونیورسٹی سے ڈی.ایس.سی. کی ڈگری لی۔ 1974 میں تورنٹو چلے گئے، اور اب وہیں اپنی بنگالی بیوی انیتا کے ساتھ مقیم ہیں۔ لڑکی آٹوا یونیورسٹی میں قانون کی پروفیسر ہے، اور لڑکا آسٹریلیا میں مینجمنٹ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ جناب بیدار بخت کی اختر الایمان، مجروح سلطانپوری، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، جمیل الدین عالی، امجد اسلام امجد، گوپال متل، پروین کومل کی منتخب نظموں کے انگریزی تراجم پر مبنی16کتابیں ہندو پاک کے مختلف اشاعتی اداروں سے شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ آپ نے "کلیات اختر الایمان" اور اختر الایمان کی موت کے بعد شائع ہونے والے مجموعۂ کلام "زمستاں سرد مہری کا" کی ترتیب و تروین محترمہ سلطانہ ایمان کے ساتھ کی اور اختر الایمان کی منتخب نظموں پر مبنی مجموعہ "درد کی حد سے پرے" مرتب کیا۔ ان کے علاوہ منیر نیازی، حیدر قریشی، عزیز قیسی، منیب الرحمٰن، ندا فاضلی وغیرہ کی نظموں کے انگریزی ترجمے 12 مختلف کتابوں میں شامل ہیں۔ مختلف رسائل و جرائد میں بھی آپ کے ترجمے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آپ نے فارسی اور سنسکرت سے بھی اردو میں کچھ نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔جناب بیدار بخت گذشتہ دنوں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ ان سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات قارئین "اردو دنیا" کی نذر ہیں۔

سوال: آپ ترجمے کی جانب کیسے مائل ہوئے؟

جواب: ایک بار ٹورنٹو میں سردار جعفری میرے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ اپنی فرانسیسی پڑوسن کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ اردو کے بڑے شاعر ہیں، میں نے ان کی دو ایک نظموں کے انگریزی ترجمے فی البدیہہ کیے تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہی میرے پہلے ترجمے تھے، مگر میرے دوست شاہین، جو کینیڈا کے شہر آٹوا میں رہتے ہیں اور اردو کے اچھے اور مشہور شاعر ہیں (پہلے شاہین غازی پوری کے نام سے لکھتے تھے)، انھوں نے یاد دلایا کہ میرے پہلے ترجمے ان کی نظموں کے تھے۔ خیر پہلے ترجمے جو بھی ہوں ترجموں کا محرک یہ خیال تھا کہ اپنی مادری زبان کی اچھی شاعری کو اوروں سے بھی متعارف کرایا جائے کہ ہمارا قد بھی کچھ اونچا نظر آئے۔ اب سے کوئی بیس پچیس سال پہلے، جب میں نے یہ کام شروع کیا تو جدید اردو شاعری کے انگریزی ترجمے بہت عام نہ تھے۔ بس فیض کے کچھ ترجمے ہوئے تھے، اور کچھ انگریزی ترجمے ن۔ م۔ راشد کی نظموں کے ہمارے مرحوم دوست حفظ الکبیر قریشی نے کیے تھے۔

سوال: ترجمے کے دوران کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

جواب: آپ نے ایسا سوال کیا ہے جس ایک پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ بہت سی دشواریاں ہیں۔ سب سے بڑی دشواری تو یہ ہے کہ اچھے شعر میں معنی کی کئی تہیں ہوتی ہیں، جن کو ترجمے میں بحال رکھنا اگر ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔ اور پھر محاورات اور تلمیحات کو کسی اور زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ ترجمہ دوسری زبان میں غیر شعری نہ ہو بہت مشکل کام ہے۔ یہ سب کہہ کر میں یہ تاثر نہیں دینا چاہتا کہ میں نے ان دشواریوں پر قابو پا لیا ہے۔ کاش ایسا ہوتا۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ ایک مترجم کو، جس زبان میں ترجمہ کر رہا ہے اور جس زبان سے ترجمہ کر رہا ہے دونوں کی لفظیات کے ساتھ ساتھ تہذیب و ثقافت سے بھی آگہی ضروری ہے۔ آپ کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور ہے لیکن کیا آپ کو کلچر سے جڑی چیزوں کا ترجمہ کرتے وقت دقّت نہیں ہوتی ہے؟ مثلاً میر کے اس شعر کا ترجمہ آپ کیسے کریں گے؟

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انھی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

جواب: سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں میر کے اس شعر کا ترجمہ اگر کروں گا بھی تو بہت مطالعے کے بعد، بہت سی لغتیں دیکھنے کے بعد۔ میرا حافظہ مشکوک ہے مگر یاد پڑتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اس شعر کے بارے میں کچھ لکھا تھا، پہلے تو اسے پڑھوں گا۔ پھر اس شعر کے ترجمے کی جرأت کروں گا۔ وہ جو بات کہی آپ نے کہ مجھے اردو اور انگریزی زبانوں پر عبور ہے، تو عبور تو خیر بڑا لفظ ہے، ان دونوں زبانوں کی مجھے شد بد ضرور ہے۔ اردو میری مادری زبان ہے۔ بچپن میں دلّی میں یہ زبان کانوں میں پڑی، پھر علی گڑھ میں تعلیم کے دوران اردو ادب سے شغف بڑھا۔ رہی انگریزی تو فیروز عالم صاحب، میں چالیس سال سے مغرب میں رہ رہا ہوں، تھوڑی بہت تو انگریزی آنا لازمی ہے۔ ویسے یہ عرض کر دوں کہ اپنے انگریزی ترجمے شائع کرنے سے پہلے کسی اہل زبان عالم کو ضرور دکھا لیتا ہوں۔

سوال: آپ نے کن کن شاعروں کے کلام کو اردو کا قالب عطا کیا ہے؟
جواب: میں نے صرف جدید اردو شاعری کا ترجمہ کیا ہے۔ فہرست تو خاصی طویل ہے، فیض، میراجی کی کھیپ کے شاعروں میں ان دونوں کے علاوہ اختر الایمان، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی، منیب الرحمٰن اور گوپال متل کے کلام کا ترجمہ کیا ہے۔ ان کے بعد کے شاعروں میں بلراج کومل، شہریار، کشور ناہید، پروین شاکر، امجد اسلام امجد، زبیر رضوی، ندا فاضلی، مظہر امام کی نظموں کے ترجمے کیے ہیں۔ کینیڈا اور امریکہ میں مقیم جن اردو شعرا کے ترجمے کیے ہیں وہ ہیں شاہین، اشفاق حسین، خالد سہیل اور پروین شیر۔ اور بھی کئی شاعروں کے کلام کو خراب کیا ہے، نام یاد نہیں آ رہے ہیں۔

سوال: آپ نے شاعری کے تراجم کی طرف زیادہ توجہ دی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟
جواب: میں نے نثر کے بھی ترجمے کیے ہیں لیکن زیادہ نہیں، اب سے کچھ مہینے پہلے تک میں نے صرف شاعری کا ترجمہ کیا تھا۔ اردو ادب میں شاعری اور شاعری کی تنقید بہت پڑھتا ہوں۔ افسانے ناول صرف چند ادیبوں کے پڑھتا ہوں، جن سے مجھے خاص شغف ہے۔ کچھ افسانوں کے ترجمے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی رخشندہ جلیل کی فرمائش پر ابھی حال ہی میں کیے ہیں۔

سوال: آپ اپنے تراجم سے کس حد تک مطمئن ہیں؟
جواب: مجھے اس مغربی ادیب کا نام یاد نہیں آ رہا جس نے لکھا تھا کہ میں اپنے ترجمے ختم نہیں کرتا، ان سے دستبردار ہو جاتا ہوں۔ میرا حال بھی اسی ادیب کی طرح ہے۔ اگر میں اپنے ترجمے کو دس بار پڑھوں گا تو دس بار اس میں ترمیم کروں گا۔ اپنے ترجموں سے مطمئن شاذ و نادر ہی ہوتا ہوں۔

سوال: ہر مترجم کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ آپ کا مقصد کیا ہے؟
جواب: بنیادی مقصد تو میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ غیر اردو دانوں کو یہ بتا سکوں کہ ہماری زبان کی شاعری بھی قابل اعتنا ہے۔ اکثر ترجمے اسی بنیادی مقصد کے تحت کرتا ہوں، مگر کبھی کبھی دوستوں کی فرمائش پر بھی ترجمے سرزد ہو جاتے ہیں۔

سوال: اس کے علاوہ اور کیا مصروفیات ہیں؟
جواب: بھائی میں روزی روٹی تو پلوں کی انجینئرنگ سے کماتا ہوں، وہی میرا کل وقتی کام ہے۔ انجینئرنگ سے جو وقت بچتا ہے اس میں سے زیادہ حصہ اردو اور کچھ انگریزی ادب پڑھنے میں صرف ہوتا ہے۔ پھر جو وقت بچتا ہے وہ ترجموں وغیرہ میں لگ جاتا ہے۔

سوال: آپ نے دوسرے لوگوں سے بھی مدد لی ہے۔ دو لوگ مل کر کام کرتے ہیں تو لائحہ عمل کیا ہوتا ہے؟
جواب: غالباً آپ کا اشارہ میرے ترجموں کی طرف ہے، جس میں میرے معاون ہمیشہ انگریزی کے ایسے اہل زبان رہے ہیں جنھیں اردو بالکل نہیں آتی۔ ان لوگوں کے ذمے پہلا کام تو یہ ہوتا ہے کہ مجھے یہ بتائیں کہ ترجمہ شدہ شعر انگریزی میں بطور اچھی شاعری کے قابل قبول ہے یا نہیں۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ بات نہیں بنی تو میں ان ترجموں کو رد کر دیتا ہوں۔ دوسری صورت میں وہ ترجمے کی نوک پلک درست کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، جسے میں اصل کو سامنے رکھ کر یا تو قبول کرتا ہوں یا رد کر دیتا ہوں۔ دو شاعر ایسے ہیں جو خود بہت اچھی انگریزی جانتے ہیں: منیب الرحمٰن اور شمس الرحمٰن فاروقی۔ ان کے کلام کا ترجمہ خود ان کے تعاون سے ہوا، اور ان ترجموں میں بہت وقت لگا اس لیے کہ شاعر انگریزی میں من و عن وہی کہنا یا کہلوانا چاہتا تھا جو اس نے اردو میں کہا۔

سوال: آپ نے انجینئرنگ کی ڈگری لی، ادب کی طرف کیسے مائل ہوئے؟
جواب: ارے بھائی ادب تو زندگی کی ضرورت ہے، جیسے کھانا پینا۔ یہ ضروری تو

نہیں ہے کہ ادب میں صرف وہ شخص ہی دلچسپی لے جس نے ادب میں ڈگریاں لی ہوں۔

سوال: شاعری میں آپ کی پسند تو آپ کے ترجموں سے ظاہر ہے۔ تنقید میں آپ کس سے متاثر ہیں؟

جواب: متاثر تو بہت سے نقادوں سے ہوں، مگر ایسے نقاد جن کی تحریروں سے میں نے براہ راست بہت کچھ سیکھا ہے چند ہی ہیں: خلیل الرحمن اعظمی، شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، وارث علوی اور شمیم حنفی۔ رشید حسن خاں کا نام نقادوں میں نہیں لیا جاتا، مگر زبان اور بیان کے بارے میں ان کی تحریروں سے میں نے جو کچھ سیکھا ہے اسے بیان ہی نہیں کرسکتا۔ ان کی مرتب کردہ کئی کتابیں ایسی ہیں جن کو صرف حواشی کے لیے پڑھتا ہوں۔

سوال: آپ ہندوستان کس سلسلے میں تشریف لائے ہیں؟

جواب: جامیہ ملیہ اسلامیہ نے مجھے ایک مہینے کے لیے اردو اور انجینئرنگ میں وزٹنگ پروفیسر کے طور پر مدعو کیا۔ انجینئرنگ میں تو میں دو کنیڈین یونیورسٹیوں میں adjunct professor ہوں، مگر اردو کی جز وقتی پروفیسری کی دعوت کو میری انا رد نہ کرسکی کہ میں تو اردو میں میٹرک فیل بھی نہیں ہوں۔

سوال: آپ کی تازہ کتاب کون سی ہے؟ اس کے چند نمونے ہمارے قارئین کے لیے عنایت فرمائیں گے؟

جواب: ایک کتاب تو اختر الایمان کی نظموں کا انتخاب ہے جو ’دردو کی حد سے پرے‘ کے عنوان سے ساہتیہ اکادمی نے 2002 میں شائع کیا تھا، اور دوسری اسی سال شمس الرحمن فاروقی کے کلام کے انتخاب اور اس کے انگریزی ترجموں کے ساتھ سٹی پریس کراچی نے شائع کی ہے The colour of black flowers کے نام سے۔ اس میں غزلوں کے منتخب شعر بھی ہیں، رباعیاں بھی اور نظمیں بھی۔ ایک غزل کے دو شعر پیش ہیں۔

شجر تناور اوپر سے\
اندر اندر گھٹتا ہوں

دل کے کنوئیں میں گرتے ہیں\
سات سمندر سنتا ہوں

ان شعروں کا ترجمہ یوں کیا ہے:

On the outside,\
a tall, proud tree\
On the inside,\
termite food.

The seven seas\
empty themselves\
in the well\
Of my heart\
or so I hear.

❑❑❑

انیس کے سلام

مرتبہ: علی جواد زیدی

انیس کے سلاموں کا یہ پہلا جامع مجموعہ ہے جس میں انیس کے تمام مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ انیس کے نوحے، ایک مناجات، ایک مقفی مخمس اور کچھ تضمینیں بھی شامل ہیں۔ سلاموں کی تعداد 102 ہے جن میں تحت اللفظ 44 اور سوز کے 58 سلام ہیں۔ انیس کے سلاموں کا یہ مجموعہ سید علی جواد زیدی نے مرتب کیا ہے۔ مقدمے میں انھوں نے نہ صرف اردو میں رثائی شاعری کی پوری تاریخ بیان کردی ہے بلکہ ہر دور میں اس صنف شاعری کے قابل لحاظ نمونوں کی خصوصیات بھی واضح کی ہیں۔

صفحات: 307، قیمت: -/60 روپے

انشا کا ترکی روزنامچہ

مصنف: انشاء اللہ خاں انشا

انشاء اللہ خاں انشا اپنے زمانے کے مستند شاعر اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ یہ روزنامچہ جو سعادت علی خاں کے دربار سے ان کی وابستگی کے دنوں کی یادگار ہے، ترکی زبان کے اس لہجے میں لکھا گیا ہے جو "چغتائی" کے نام سے موسوم ہے۔ ڈاکٹر نعیم الدین نے یہ ترجمہ براہ راست ترکی زبان سے کیا ہے اور مقدمے میں اس کی لسانی خصوصیات اور اس کے مندرجات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

صفحات: 68، قیمت -/4.50 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

فیاض عالم

شاہد حسن کمال سے گفتگو

پروفیسر شاھد حسن کمال گورنمنٹ کالج، کراچی میں اردو کے استاد ھیں۔ آپ نہ صرف ایک اچھے شاعر ھیں بلکہ ایک معتبر نقاد بھی ھیں۔ آپ کا شعری مجموعہ "رسم تکلم" کے نام سے شائع ھو چکا ھے۔ اس کے علاوہ " کراچی میں اردو غزل اور نظم" "جائزہ ادبیات اردو " اور " جھان قواعد و انشا" آپ کی تنقیدی تصانیف ھیں۔ آپ نے کئی اچھے ڈرامے بھی لکھے ھیں۔ گذشتہ دنوں جناب شاھد حسن کمال غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے منعقدہ بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کی غرض سے ھندوستان آئے تھے۔ ان سے کی گئی گفتگو کے اھم اقتباسات قارئین " اردو دنیا" کی نذر ھیں۔

سوال: آپ کی شاعری کا آغاز کب ہوا اور اس کے محرکات کیا تھے؟

جواب: میں کراچی کے جس علاقے میں پیدا ہوا وہاں علمی و ادبی ماحول تھا۔ میرے دادا جان شعر و سخن کے دلدادہ تھے اور انھی کی صحبت میں رہ کر شعر و ادب سے مجھے رغبت ہوئی۔ میں تیسری چوتھی جماعت میں ''بانگ درا'' اور '' آتش گل'' پڑھ چکا تھا۔ میں آٹھویں جماعت میں تھا جب پہلی نظم لکھی۔ اسے لے کر داد کی غرض سے دادا جان کے پاس گیا لیکن خلاف توقع بیداد ملی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ ابھی پڑھنے لکھنے کی عمر ہے، ذرا بڑے ہو جاؤ پھر شعر گوئی کی طرف توجہ کرنا۔ اس کے بعد کافی عرصے تک میں نے شاعری نہیں کی۔ ایم۔اے کرنے کے بعد پھر اس جانب مائل ہوا۔

سوال: آپ ہند و پاک کے کن شعرا سے متاثر ہیں؟

جواب: اردو کا پورا کلاسیکی شعری سرمایہ مجھے متاثر کرتا ہے۔ دور جدید میں برصغیر کی شاعری نظریے سے متاثر رہی ہے۔ نظریے کا مقصد پورا ہونے کے بعد وہ شاعری اپنی افادیت کھو بیٹھتی ہے۔ اس کے باوجود کچھ شعرا ایسے ہیں جن کے یہاں فکر اور فن کا حسین امتزاج ملتا ہے۔ مجروح صاحب نے بہت اچھا لکھا۔ کیفی اعظمی، شہریار، مصطفٰے زیدی، شکیب جلالی، جون ایلیا، سلیم کوثر، احمد فراز اور سراج الدین ظفر کی شاعری مجھے بہت پسند ہے۔

سوال: پاکستان کی علاقائی زبانوں کی شکایت ہے کہ خصوصاً اردو والے مہاجر وہاں کی علاقائی زبانوں کا مطالعہ نہیں کرتے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر صوبۂ پنجاب سیاسی اعتبار سے طاقتور نہ ہوتو پنجابی زبان بھی کنارے کر دی جائے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ہمارے یہاں اس طرح کا کوئی تنازعہ نہیں ہے۔ چند لوگ ہیں جو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ اردو کے سرمایۂ الفاظ میں ہر زبان کے الفاظ موجود ہیں اور یہ سب کو خوش دلی سے قبول کرتی ہے۔ اردو اور پنجابی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پنجابیوں نے اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ حالی، اقبال، فیض، احمد ندیم قاسمی، امجد اسلام امجد، انور سجاد، انور سدید، قتیل شفائی، عبیداللہ علیم، سلیم کوثر سب کا تعلق پنجاب سے ہے۔ رہا سوال مہاجرین اور پاکستان کی علاقائی زبانوں کے رشتے کا تو اردو بیشتر مہاجرین کی مادری زبان ہے۔ کراچی اور حیدرآباد میں جو مہاجرین آئے تو فطری طور پر ابتدا میں ان کا ذریعۂ تعلیم اردو بنی۔ بہ طور خاص مہاجروں میں آج بھی اردو کے تئیں بہت جوش و خروش ہے اور وہ پاکستان میں بہ حیثیت مجموعی اردو کے بہتر مستقبل کے لیے کوشاں ہیں۔

سوال: پاکستان میں اردو زبان و ادب کی صورت حال پر کچھ روشنی ڈالیے؟

جواب: ہمارے یہاں شاعری بہت اچھی ہو رہی ہے، تحقیق کا معیار بھی اعلیٰ ہے۔ کراچی یونیورسٹی میں تحقیق کا معیار اعلیٰ ہے۔ ہندوستان میں نثر خصوصاً کہانیاں بہت اچھی لکھی جا رہی ہیں۔ یہاں اردو کے شعبے اور کتب خانے بھی زیادہ ہیں۔ پاکستان میں آج کل فلمی نغمے اتنے اچھے نہیں لکھے جا رہے ہیں جتنے کہ ہندوستان میں، یہاں جاوید اختر بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ جہاں تک اردو تعلیم کا سوال ہے تو ہمارے یہاں جو تعلیمی اصول ہے وہ ہندوستان کے سہ لسانی اصول سے کچھ حد تک مختلف ہے۔ ہندوستان میں ایک صوبائی زبان، دوسری ہندی بطور سرکاری زبان جسے آئین ہند میں Official Language of

the Union کہا گیا ہے، اور ایک انگریزی۔ جنوبی ہند کی بعض ریاستوں میں یہ گنجائش بھی ہے کہ اگر کوئی طالب علم چوتھی زبان پڑھنا چاہے تو اسے اس کی آزادی ہوگی۔ اس اصول سے مادری زبان اور ہندی کے درمیان، ہندی اور انگریزی کے درمیان تصادم ختم ہو جاتا ہے۔ میرے خیال میں یہ بہت بہتر صورت ہے۔

سوال: ہندوستان اور پاکستان کے درمیان غلط فہمیوں اور دوریوں کو ختم کرنے کے لیے ادبی سطح پر کیا کیا جا سکتا ہے؟

جواب: پاکستان میں آسانی سے ہندوستانی کتابیں دستیاب نہیں ہو پاتی ہیں۔ جب تک دونوں ملکوں میں کتابوں کی آزادانہ تجارت نہ ہو اس وقت تک ادب کی سطح پر بھی دوری رہے گی اور دیگر معاملات میں بھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کتب و رسائل اور ادیبوں اور شاعروں کی دونوں ممالک میں آزادانہ آمد و رفت ہو تا کہ ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملے۔ اس دوستانہ اور آزادانہ فضا میں جو ادب تخلیق ہوگا وہ ایک خوشگوار فضا پیدا کر سکے گا۔

سوال: کیا آپ ہندوستان اور پاکستان کی اردو کے درمیان کوئی فرق محسوس کرتے ہیں؟

جواب: ہمارے یہاں اردو میں علاقائی زبانوں کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ اب تک علاقائی زبانوں کے کم از کم پچاس ہزار الفاظ پاکستان کی اردو میں شامل ہو چکے ہیں اور مستعمل ہیں، لیکن ہندوستان کی اردو میں وہ الفاظ استعمال نہیں ہوتے۔ ہندوستان اور پاکستان کی اردو میں یہیں سے حدِ فاصل کا آغاز ہوتا ہے۔ یہیں سے ایک نیا لسانی مسئلہ پیدا ہوتا ہے جو کئی لسانی پیچیدگیوں کا سبب ہے۔ اس کی وجہ سے ہندوستانی اور پاکستانی اردو کا منظر نامہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا جا رہا ہے۔

سوال: ادبی سطح پر ہندوستان اور پاکستان کی اردو میں کیا فرق ہے؟

جواب: پاکستان شمالی مغربی برصغیر میں واقع ہے اور یہ علاقہ شمالی، مشرقی اور جنوبی برصغیر سے لسانی اعتبار سے مختلف ہے۔ یہاں کے اردو ادب میں علاقائی حسیت اور علاقائی ضروریات کے تحت زبان و بیان اور محاورے میں تبدیلیاں، اور علاقائی زبانوں کے اثرات روز بروز نمایاں ہوتے جا رہے ہیں۔ حدِ فاصل کی بحث سے قطع نظر، پاکستان میں لکھے جانے والے ناولوں اور افسانوں اور شاعری کی زبان پر وہاں کے معاشرتی تناظر کے اثرات واضح طور پر نمایاں ہیں۔

سوال: پاکستان کے کن موجودہ شاعروں اور ادیبوں کے یہاں سیاسی حالات کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے؟

جواب: گذشتہ 59 برس کے عرصے میں شاید ہی کوئی ایسا اہم واقعہ ہوا ہو جس کو پاکستانی شعرا نے موضوع نہ بنایا ہو۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، حبیب جالب، احمد فراز، جون ایلیا، حسن عابدی، فارغ بخاری، ظہیر کاشمیری، عزیز حامد مدنی، سحر انصاری، انجم اعظمی، امجد اسلام امجد، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، واحد بشیر، فاطمہ حسن، ناصر حمید جیسے تمام شاعروں کی تخلیقات میں احساس کی سطح پر واضح ردِ عمل کا اظہار موجود ہے۔ پاکستان کے ادیبوں، شاعروں اور عوام کا کلیدی جذبہ جمہوریت رہا ہے۔

سوال: عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستانی شاعروں کی موجودہ نسل پر فیض کا اثر کچھ زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: پاکستانی ادب پر فیض کے گہرے اور دور رس اثرات ہیں لیکن وہاں کی نئی نسل نے مجروح سلطانپوری اور اختر الایمان سے بھی خاصا اکتساب کیا ہے حالانکہ فیض اور مجروح میں مجروح زیادہ کلاسیکی ہیں اور یورپی شعرا سے کم متاثر بھی۔ اختر الایمان کی نظموں میں منفرد انداز ملتا ہے۔ انھوں نے چست اور گٹھی ہوئی نظمیں تخلیق کی ہیں۔ ان کے یہاں وحدت تاثر آخر تک برقرار رہتی ہے۔ بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ وہ ڈکشن سے بے خبر ہیں مگر یہ بے خبری خود اختیاری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فیض کے مقابلے میں اختر الایمان زیادہ شعوری فنکار ہیں۔

سوال: پاکستان میں کن ہندوستانی شاعروں اور ادیبوں کو شہرت حاصل ہے؟

جواب: ہندوستانی ادیبوں میں کئی شخصیات ایسی ہیں جو بے مثال ہیں۔ میرے خیال میں شمس الرحمٰن فاروقی عصر حاضر کے عظیم نقادوں میں سے ایک ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی بہت اچھے نقاد ہیں۔ قرۃ العین حیدر ہندوستان میں رہتی ہیں یہ آپ لوگوں کی خوش قسمتی ہے مگر ان کی بہترین تحریریں قیامِ پاکستان کے زمانے میں وجود میں آئیں۔ ہندوستانی شعرا میں شجاع خاور کے یہاں ایک نیا رنگ و آہنگ دیکھا جا سکتا ہے۔

□□□

ساجدہ زیدی

عہدِ طفلی اور ذہنی آزادی

بچوں کی زندگی والدین اور اساتذہ کے لیے ایک خوشگوار چیلنج ہوتی ہے۔ جس میں ذمے داریاں بھی ہیں اور لطف و مسرت کے امکانات بھی۔

اوائل عمر کی نفسیاتی کیفیات میں سے اگر بہ فرضِ محال کسی ایک کیفیت کا انتخاب کیا جائے، جس پر انسان کی ذہنی صحت کا دارو مدار ہو سکتا ہے، اور عہدِ شباب اور دورِ بلوغت میں فرد اپنی زندگی سے مطمئن رہ سکتا ہے، تو جذباتی آسودگی و تحفظ کے علاوہ وہ تجربہ آزادیِ ذہن کا ہوگا۔ آزادیِ ذہن و فکر ایک ایسا انسانی atribute ہے جس کے بغیر اگر ایک طرف قومیں زوال پذیر ہو جاتی ہیں اور معاشرہ بنجر ہو جاتا ہے تو دوسری طرف انفرادی زندگی معنویت اور رنگ و آہنگ سے محروم رہ جاتی ہے اور اس میں ٹھہرے ہوئے پانی کی سی کثافت در آتی ہے، یعنی ایک ایسی نفسیاتی گھٹن جس کا ازالہ نہ عیش و آرام سے ممکن ہے نہ ہی قوت و دولت کی فراوانی سے۔

اس انسانی صفت کی بنیادیں پڑتی ہیں بچپن اور نوعمری میں۔ اور آزادی کی بنیاد آزادی ہی ہوتی ہے پابندی نہیں۔

ہمارا معاشرہ اور نظامِ تعلیم بڑی حد تک بالغ زندگی کے تقاضوں اور مسائل پر مبنی ہے۔ بلکہ یہ کہنا مبالغہ آرائی نہ ہوگا کہ دنیا کے زیادہ تر معاشروں میں یہی صورتِ حال ہے، کہنے کا مدعا یہ ہے کہ ہمارے معاشرے کی اقدار، رویے، آداب و اطوار، قواعد و ضوابط، مسائل اور ان کے حل، منصوبے اور ان پر عمل، مقاصد و معیارات سب کا تانا بانا بالغ زندگی کے تقاضوں سے بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عہدِ طفلی سے عنفوانِ شباب تک کا زمانہ مستقبل کی تیاری کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اس عرصۂ حیات میں بچوں اور نوجوانوں کو معاشرے کی ان تمام اقدار و رجحانات کا تابع بنانے کی کوشش کی جاتی ہے جو بزرگوں، والدین، اساتذہ، اور دیگر اہم شخصیات کی نظر میں ان کی آئندہ زندگی کی کامیابی، خوشحالی اور آسودگی کی ضمانت ہوتے ہیں یعنی بچوں کو ایک کامیاب شہری بنانے اور سماج سے مطابقت پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

ہر چند کہ اس نقطۂ نظر کے بھی اپنے جواز موجود ہیں اور اس کی افادیت ثابت کرنے کے لیے متعدد دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں، اور پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس جوش میں ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ بچوں کی اپنی الگ دنیا ہوتی ہے۔ اس دنیا کے سماجی اور نفسیاتی دونوں قسم کے اپنے تقاضے، آسودگیاں، مسائل اور دباؤ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیمی اور نفسیاتی اعتبار سے بچے زمانۂ حال میں زندہ رہتے ہیں نہ کہ مستقبل میں۔ ان کی ذہنی آزادی، جذباتی آسودگی، اور جسمانی ترقی اور نشو و نما کے لیے لمحۂ موجود کی، اس ''شاندار مستقبل'' سے کہیں زیادہ اہمیت ہوتی ہے جو ان کے لیے سماج یا بزرگوں نے طے کر رکھا ہے۔ اور جس کی تیاری میں ان کے معصوم، آزاد اور بے فکر بچپن کے خوشگوار برس بے کیفی اور بوریت کی نذر ہو جاتے ہیں۔

علاوہ بریں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ — اگر ہم یہ مان لیں کہ عہدِ طفلی میں تعلیمی اور تربیتی سلسلہ محض مستقبل کی زندگی کی تیاری ہے، یعنی ہمیں اپنے بچوں کے ذہنوں کو محض طے شدہ اقدار، رویوں اور اطوار کی تربیت دینی ہے؛ تو اس صورت میں فرسودہ فکری سانچے میں دراڑیں کون ڈالے گا؟ ان مقررہ رویوں کی نفی کون کرے گا جو ہمارے غیر اخلاقی یعنی مذموم سماج کا حصہ بن چکے ہیں؟ ان اقدار میں شگاف کون ڈالے گا جن کی بدولت محض دولت و قوت کا حصول زندگی کا حصہ بن چکا ہے؟ اور جن کی بالا دستی کی بنا پر سماج میں ذہنی، اخلاقی، اور تخلیقی سطحوں پر ارتقا اور تبدیلی کی گنجائش محدود ہو گئی ہے؟ کیا ہم تاریخی پس منظر میں اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ:

''ہر کس کہ شد صاحب نظر، دین بزرگاں خوش نہ کرد۔''

اور ''گفت روی، ہر بنائے کہنہ کاں باداں کنند

می نہ دانی، اول ایں بنیاد را ویراں کنند''

مدعا یہ ہے کہ کچے ذہنوں کو کسی مقررہ سانچے میں مقید کرنا اور کسی مخصوص سماجی فریم ورک میں جڑ دینا، ذہن کے ارتقا، بالیدگی، اور صحت کی نفی کرنا ہے، جو آزادی کی فضاؤں ہی میں پروان چڑھ سکتے ہیں۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ نکتہ سمجھنے کے لیے ذہنی آزادی کا رشتہ نفسیاتی طور پر ایک بھرپور زندگی سے جوڑنا ہوگا۔ سمجھنا ہوگا کہ عہدِ طفلی اور عنفوانِ شباب کے تقاضے کیا ہیں؟ بچوں میں کیا کیا صلاحیتیں ہو سکتی ہیں؟ اور ان کی نشو و نما کے کیا طریقے ہیں؟ اور نفسیاتی طور پر آسودہ و بالیدہ زندگی، محروم اور محدود

زندگی کے مقابلے میں کس طور پر ذہنی اور فکری آزادی کی ضامن ہوسکتی ہے۔

تعلیمی نفسیات کی رو سے بچوں کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کا اظہار، ابتدا ہی سے، ان کے کھیلوں، مشاغل، دوستیوں، محبتوں، بیزاریوں اور دلچسپیوں کے ذریعے ہوتا رہتا ہے۔ شخصیت کے ان پہلوؤں میں بچوں کی مخصوص صفات، (مثلاً، ہمدردی یا بیدردی، سخاوت یا کنجوسی، ملنساری یا خود کفالت وغیرہ) ان کے رویے، (مثلاً دوستانہ، مخلصانہ، لاپرواہی وغیرہ) ان کے مخصوص رجحانات (مثلاً کھلنڈراپن، سنجیدگی، فارملزم، تخلیقیت وغیرہ اور ان کا میلانِ طبع وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ جن کا سلسلہ بہت طویل ہوتا ہے۔ اکثر رویوں اور اقدار کی تشکیل، عمر کے ارتقا کے ساتھ ساتھ، ماحول کے زیر اثر بعد میں ہوتی ہے شخصیت کے یہ پہلو ایک طرف تو بچوں کی ذہنی، جذباتی، جسمانی، تخئیلی، تخلیقی اور سماجی ابعاد کا احاطہ کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف بچوں کی جبلتوں، صلاحیتوں، اوصاف، رجحانات، میلانات، اور رویوں کا متعدد شکلوں اور مختلف سطحوں پر اظہار ہوتا ہے۔ یہ تمام پہلو، بچوں کی شخصیت کے آسمان پر کہکشاں کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی دیکھنے میں تو ایک روشنی کا اٹوٹ سلسلہ سا، مگر در اصل، اور بہ نظرِ غائر مشاہدے کی صورت میں لا تعداد ستاروں (پہلوؤں) کا مجموعہ — یہ رجحانات و میلانات اور جبلتیں و صلاحیتیں اتنی قوی ہوتی ہیں کہ اپنے اظہار کے مختلف راستے ہمیشہ تلاش کرتی رہتی ہیں۔ ان پر بند باندھ کر ان کا رخ تو متعین کیا جا سکتا ہے، لیکن شخصیت کے ان سر چشموں کا گلا گھونٹ کر ان کو مقید نہیں کیا جا سکتا، کہ ایسی صورت میں یہ سرچشمے کسی اور جگہ سے پھوٹ پڑیں گے۔ بہ الفاظِ دیگر اگر انھیں اپنے اظہار کے آزادانہ اور مناسب راستے نہیں ملیں گے تو وہ غیر راستی شکلوں میں اور تخریبی کارروائیوں میں اپنی راہ معکوس ڈھونڈ نکالیں گے جو سماج و متعلقین کے لیے ناپسندیدہ و تکلیف دہ اظہارات ہوں گے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ غیر صحت مند اور مریضانہ اظہارات بچوں کی شخصیت کو مسخ کر دیں گے۔ چنانچہ ہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتے کہ اگر ان ابعادِ شخصیت کے سمجھنے میں کوتاہی کی جاتی ہے، یا ان نفسیاتی تقاضوں پر بے جا جذباتی دباؤ ڈالا جاتا ہے تو بچوں کی ذہنی نشو و نما، شخصی بالیدگی، اور جذباتی زندگی پر اس کے بہت مضر اثرات پڑتے ہیں۔ بے جا دباؤ کی صورت میں بچوں کے سامنے دو تین ہی صورتیں ہوتی ہیں۔ (1) یا تو وہ ماحول و معاشرے کے جبر اور والدین اور استادوں کے اقتدار کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں، اپنے نفسیاتی تقاضوں کے اظہار اور اثبات سے ڈرنے لگتے ہیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ اپنی ذات اور اس کے امکانات سے دور ہوتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ خارجی اور معاشرتی توقعات کے سانچوں میں ڈھل کر وہ اپنی ذات سے بیگانہ، اور اپنی ذہنی و جذباتی زندگی سے اجنبی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اور یہ حادثہ انسانی قوتوں کی موت کا حادثہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے امکانات کی دنیا سکڑ اور سمٹ جاتی ہے۔

دوسرا ردِعمل، بے جا نفسیاتی دباؤ کا یہ ہوتا ہے کہ بچے ماحول کے جبر کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں۔ یہ بغاوت بیشتر صورتوں میں سماجی یا سیاسی نہیں بلکہ نفسیاتی ہوتی ہے۔ اس کا مظاہرہ نہ صرف منفی رویوں مثلاً شدید غصہ، نفرت، کدورت، مخاصمت، جارحیت، تخریب کاری، حکم عدولی اور ایک قسم کی جاری و ساری منافرت کی شکل میں ہوتا ہے، بلکہ بسا اوقات اس کا رخ خود اپنی ہی شخصیت کی جانب مڑ جاتا ہے۔ بچہ خود اپنی ذات سے برسرِ پیکار ہو جاتا ہے، اور خود شکستگی، احساسِ کمتری، اور احساسِ بے مائیگی میں مبتلا ہو کر خود اپنی نفی و تخریب کرنے پر مائل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی بچے کی طبیعت میں نرمی ہوتی ہے تو یہ خود اذیتی اور ایک قسم کی دبی دبی جھنجھلاہٹ کی شکل میں ظاہر ہونے لگتی ہے جو بالآخر نیوروسس کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ اور یہ سانحہ بھی انسانی امکانات کی پسپائی کا سانحہ ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ سب صورتیں، یعنی ذات سے فرار، ذات کا جارحانہ اظہار یا خود تخریبی، ذہنی آزادی و شخصی نشو و نما کی ضد ہیں۔

ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ذہنی آزادی کی تربیت یا رہنمائی کس طرح ممکن ہے؟۔ میرا خیال ہے کہ اس ضمن میں سب سے پہلے تو ہمیں بچوں کے ان عام رجحانات کو سمجھنے کی ضرورت ہے جو بالکل انفرادی تو نہیں ہوتے لیکن تھوڑے بہت رد و بدل کے ساتھ تقریباً تمام نو عمروں میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً، کھیل و تفریح کی طرف رجحان اور اس وسیلے سے اپنے مختلف جذباتی تقاضوں کی تسکین۔ مثلاً نامعلوم کی جستجو اور ذوقِ تجسس، اور اس کے ذریعے چیزوں کی نوعیت و ماہیت جاننے کی خواہش، مثلاً نامعلوم کی طرف کشش اور سوالات کرنے کی عادت مثلاً جودتِ طبع، اور اس کی مدد سے ماحول پر اپنی طبیعت کے مطابق انوکھے طریقوں سے ردِعمل۔ مثلاً مجرد خیالات اور باضابطہ تحریکات کی بہ نسبت عملیت، حسیت اور ٹھوس حقائق کی طرف رجحان۔ مثلاً معروضیت کے مقابلے میں موضوعیت کی طرف جھکاؤ وغیرہ....ان عام رجحانات کا علم و ادراک، بچوں کی ذہنی تربیت کے سلسلے میں ہماری بڑی معاونت کر سکتا ہے۔

ان عام رجحانات کے علاوہ ہمیں خالص انفرادی رجحانات اور مخصوص صلاحیتوں کو سمجھنے کی بھی کوشش کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر بعض بچوں کا جھکاؤ فنونِ لطیفہ کی طرف ہوتا ہے۔ یعنی انھیں رنگ و بو، ترنم و آہنگ، موسیقی اور آرٹ، الفاظ اور صوری حسن زیادہ متاثر کرتے ہیں، اور بعض کا جھکاؤ سائنس کی طرف ہوتا ہے۔ یعنی انھیں اشیا کی ماہیت جاننے کی جستجو بے چین رکھتی ہے۔ ٹھوس حقائق متاثر کرتے ہیں، اور فطرت کے حسن کے بمقابلہ فطرت کی نوعیت جاننے کی خواہش نمایاں ہوتی ہے۔ علاوہ بریں بعض بچوں میں عملی صلاحیت مخصوص طور پر نمایاں ہوتی ہے بعض میں فکری۔ بعض لیڈرشپ کی طرف مائل ہوتے ہیں تو بعض تخلیقی اظہار کی طرف، بعض میں لسانی صلاحیتیں فطری طور پر ظاہر ہوتی ہیں تو بعض میں مصوری و نقاشی وغیرہ کی۔ غرض نفسیاتی طور پر بچے بہت اوائل عمر ہی میں اپنی انفرادی خصوصیات کا اظہار کردیتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم انھیں دیکھنے کے لیے نظر پیدا کریں، ان کی نشو ونما، آزادانہ اظہار، تربیت، ارتفاع کرنے اور ان کا صحیح رخ متعین کرنے کے لیے کوشاں رہیں کہ ذہنی آزادی نہ تو نفسیاتی خلا میں پرورش پاتی ہے اور نہ ہی جذباتی گھٹن اور ذہنی نا آسودگی کی فضاؤں میں پروان چڑھتی ہے۔ ذہنی آزادی کی نشو ونما کے لیے ایک بھرپور شخصیت اور تربیت یافتہ ذہن کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور یہ خصوصیات صرف بالغوں کا ہی حصہ نہیں ہوتیں، جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ ایک شاداب، مطمئن، اور جذباتی طور پر محفوظ و مامون بچپن کی بھی پہچان ہیں۔

جس حد تک والدین اور اساتذہ گھروں اور تعلیم گاہوں کے ماحول کو بچوں کے لیے سازگار بنائیں گے، اسی حد تک یہ ادراک عہدِ طفلی کے ناپختہ ذہن اور نرم و نازک جذباتی زندگی کی صحت مند نشو ونما کے ضامن ہوں گے۔

سازگار ماحول میں بزرگوں اور بالغوں، اساتذہ اور دیگر اہم شخصیات کے اقتدار اور آمریت کا دور دورہ نہیں ہوتا۔ بلکہ بچوں کو اپنے جذبہ و خیال کے آزادانہ اظہار کی سہولت میسر ہوتی ہے۔ ایسا آزادانہ اظہار جس میں جارحیت اور خودنمائی کے عناصر کی کارکردگی نہ ہو بلکہ نامحسوس طور طریقوں سے تربیت و رہنمائی بھی جاری رہے اور بچوں کی دلچسپیوں کا صحت مند اور قابلِ قبول انداز سے رخ بھی متعین ہوتا رہے۔ یہ ضروری ہے کہ بچوں کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ وہ اپنے خیالات کے اظہار میں دلچسپیوں کے انتخاب میں اور صلاحیتوں کے مظاہروں میں آزاد ہیں۔ ان کی رائے کی اہمیت ہے۔ ان کی شخصیت کی قدر ہے۔ وہ بڑوں کے تابع مہمل کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اپنی انفرادی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ انھیں ایک ایسی جذباتی آسودگی کا احساس ہونا ضروری ہے جس کی بنیاد محفوظیت کا احساس اور محبت و دلجوئی کا رویہ ہوتا ہے۔ تاکہ بچے یہ باور کرسکیں کہ ان کی نگہداشت، بڑوں کی عنایت، احسان نہیں بلکہ ان کا اپنا پیدائشی حق ہے اور یہ کہ یہ نگہداشت و پرداخت، ایک فطری عمل ہے، یعنی وہ ایک آزادانہ فضا میں پروان چڑھیں۔ نفسیاتی طور پر اس نوع کی آسودہ و مطمئن زندگی ہی ایک ایسے ذہن کی پرداخت کی ضامن ہو سکتی ہے، جو آزادیِ خیال و آزادیِ اظہار کے قابل بن سکے۔ ذہنی تربیت کا یہ انداز خاصا دشوار گزار لیکن ناگزیر ہے۔

اس گفتگو سے ہم چند ایسے نتائج اخذ کرسکتے ہیں، جو بظاہر تو عام بات معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جن کا اثبات کرنے کے سلسلے میں والدین و اساتذہ کو علم و ادراک کے علاوہ بڑے نفسیاتی ریاض کی ضرورت ہوتی ہے:۔

☆ ذہنی آزادی ایک ایسا انسانی atribute ہے جس کی غیر موجودگی میں قوموں کی زندگی زوال پذیر اور افراد کی زندگی حسن و معنویت، بے باکی خود اعتمادی و بے ساختگی سے عاری ہو جاتی ہے۔

☆ ذہنی آزادی کی بنیاد نو عمری، بلکہ اوائلِ طفلی ہی میں پڑتی ہے۔

☆ ذہنی آزادی کا نفسیاتی آسودگی و ذہنی تربیت سے گہرا رشتہ ہے۔

☆ ذہنی تربیت دراصل بچوں اور نوعمروں کی ذات کے نفسیاتی تقاضوں کو سمجھنے، ان کی پذیرائی کرنے، اور بچوں کی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا دوسرا نام ہے۔

☆ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اس امر کا شعوری ادراک اور اعتراف کریں کہ بچوں کی اپنی دنیا ہوتی ہے، جس کے تقاضے بچوں کی ذہنی و جذباتی زندگی سے منسلک ہوتے ہیں، نہ کہ بالغوں کے فرسودہ امر و نہی کے تصورات سے۔ بچے چھوٹے چھوٹے مرد اور عورتیں نہیں ہوتے بلکہ ایک خود مرکز جیتی جاگتی، محسوس کرتی مخلوق ہوتے ہیں جن کے اپنے تخیلی اور تخلیقی تقاضے ہوتے ہیں۔

☆ بچوں کا ایک ایسے سازگار ماحول میں پروان چڑھنا ضروری ہے جس میں ان کی شخصیت اور انفرادیت کو کھلے ذہن کے ساتھ قبول کیا جائے۔

☆ ایک بھرپور، آزاد، آسودہ، اور صحت مند نفسیاتی زندگی، اور جذباتی تسکین کے اسباب مہیا کرنا ہی ذہنی تربیت ہے اور یہی ذہنی تربیت ذہنی آزادی کا سرچشمہ ہے۔

☆ بچوں کی ذہنی آزادی سے انکار اور اس کی نفی، قوتِ حسیات کی موت ہے۔ اور یہ ایسا سانحہ ہے، جس کے نتیجے کے طور پر امکانات کی دنیا سمٹ کر رہ جاتی ہے۔

□□□

محمد حسن فاروقی

مہاراشٹر میں اردو تعلیم

2001 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں ریاست مہاراشٹر آبادی کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر ہے۔ مہاراشٹر کی آبادی 96,878,627 (نو کروڑ اڑسٹھ لاکھ اٹھہتر ہزار چھ سو ستائیس) ہے۔ ریاست میں 63965943 (چھ کروڑ انتالیس لاکھ پینسٹھ ہزار نو سو تینتالیس) خواندہ افراد موجود ہیں۔ اس طرح ریاست میں خواندگی کی مجموعی شرح 66.2 فی صد ہے۔ مردوں کی خواندگی کی مجموعی شرح 73.77 اور عورتوں کی خواندگی کی مجموعی شرح 57.62 فی صد ہے مسلمانوں کی آبادی 10,270,485 (ایک کروڑ دو لاکھ ستر ہزار چار سو پچاسی) ہے۔ جس میں مردوں کی تعداد 5437926 (چوّن لاکھ سینتیس ہزار نو سو چھبیس) اور عورتوں کی تعداد 4832559 (اڑتالیس لاکھ بتیس ہزار پانچ سو انسٹھ) ہے۔ گویا مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 10.6 فی صد ہے۔ یہ حقیقت چونکا دینے والی ہے کہ مہاراشٹر کے مسلمانوں کی خواندگی کی شرح 78.1 فی صد ہے جس میں مسلم عورتوں کی خواندگی کی شرح 70.8 فی صد ہے۔ اردو والوں پر جہالت اور تعلیمی پسماندگی کے جو الزامات لگائے جاتے ہیں، سرکاری اعداد و شمار انھیں غلط ثابت کررہے ہیں۔ خواندگی کی یہ اونچی شرح شاید ہمارے احساس کمتری کو بھی کچھ حد تک دور کردے۔ (مزید تفصیل کے لیے اس مضمون کے آخر میں جدول ملاحظہ کریں۔)

یہ حقیقت ذہن نشیں رہے کہ مجموعی طور پر مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہے۔ ہمارا کثیر علمی و ادبی سرمایہ اور مذہبی ادب اسی زبان میں ہے۔ غیر اردو داں طبقہ بھی اس کی شیرینی کا معترف ہے۔ طلبہ کو اپنی مادری زبان سے والہانہ لگاؤ ہوتا ہے، اس لیے یہ زبان ہمارے لیے غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔

اردو تعلیم کو سہولت کی خاطر دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اول یہ کہ تمام مضامین اسی زبان میں پڑھائے جائیں۔ دوم اس زبان کا مطالعہ بطور ایک مضمون کے کیا جائے۔ ابتدائی، ثانوی اور کچھ حد تک اعلیٰ ثانوی سطح پر ہمارا ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ ان اداروں میں طلبہ کثیر تعداد میں زیر تعلیم ہیں اس لیے اس حصے کا جائزہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یونیورسٹی کی سطح پر جو طلبہ گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کے لیے اردو بحیثیت خصوصی مضمون اختیار کرتے ہیں ان کا ذریعۂ تعلیم بھی اردو ہوتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں اردو بحیثیت ایک مضمون کے بھی شامل نصاب ہے۔

ہندوستان میں مہاراشٹر، کرناٹک اور بہار میں اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکول بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مرحوم اکبر رحمانی نے اپنے مضمون میں مہاراشٹر میں اردو میڈیم اسکولوں کے پھلنے پھولنے کی دو اہم وجوہات بتائی ہیں۔ ''ایک تو حکومت کی روشن خیالی، دوسرے مہاراشٹر کے مسلمانوں کی اردو سے محبت اور اس کی بقا اور فروغ کے لیے جدوجہد۔ مہاراشٹر میں لسانی تعصب کم ہے۔ اردو کو ریاستی زبان مراٹھی کا حریف نہیں سمجھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست میں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اسکولوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ حکومت نہ صرف انھیں منظوری دیتی ہے بلکہ گرانٹ یا مالی امداد بھی دیتی ہے۔ عام اردو میڈیم اسکولوں کے علاوہ پرائمری اسکول کے اساتذہ کے لیے اردو میڈیم کے ٹریننگ کالج تقریباً ہر ضلع میں موجود ہیں۔ ثانوی درجات کے اساتذہ کے لیے بھی ٹریننگ کالج کھلتے جارہے ہیں۔ الغرض اردو میڈیم اسکولوں کی بدولت ہزاروں افراد کو روزگار مل رہا ہے اور لاکھوں طالب علم اردو سیکھ رہے ہیں۔'' (اردو زبان 7 نومبر 1999)

ذیل کے جائزے سے مہاراشٹر میں اردو تعلیم کی صورت حال اور ترقی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ اعداد و شمار تعلیمی سال 2001-2002 کے ہیں۔

پورے مہاراشٹر میں اردو ذریعۂ تعلیم کے 2634 پرائمری اسکول جاری ہیں جن میں 792250 طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں۔ 18108 اساتذہ انھیں زیور تعلیم سے آراستہ کرارہے ہیں۔ ثانوی مدارس کی تعداد 809 ہے۔ طلبہ و طالبات کی تعداد 377606 اور اساتذہ کی تعداد 10207 ہے۔ جونیئر کالج کی تعداد 100 کے قریب ہے۔ 42 ڈی ایڈ کالج ہیں۔ 4 لڑکوں کے لیے 13 لڑکیوں کے لیے اور 25 مشترکہ طور پر دونوں کے لیے۔ تقریباً 25 بی ایڈ کالجوں میں اردو بحیثیت ایک اختیاری مضمون پڑھانے کا انتظام ہے۔

ریاست مہاراشٹر میں بعض بڑے شہر ایسے ہیں جنھیں اردو کا مرکز تسلیم کیا جاتا ہے۔ ذیل کے جائزے سے ان مراکز کی تعلیمی صورت حال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ممبئی کارپوریشن کے تحت 205 اردو پرائمری اسکول جاری ہیں۔ جن میں کم وبیش ڈیڑھ لاکھ طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں۔ نجی (Private) پرائمری

اسکولوں کی تعداد 65 ہے۔ شہر ممبئی میں اردو کے 109 ہائی اسکول اور 12 شبینہ ہائی اسکول جاری ہیں۔

☆ مالیگاؤں: کارپوریشن کے پرائمری اسکول 87، پرائیویٹ پرائمری اسکول 28، ہائی اسکول 30 اور جونیئر کالج 5۔

☆ اورنگ آباد: کارپوریشن کے پرائمری اسکول 35، پرائیویٹ پرائمری اسکول 33، ہائی اسکول 25، اور جونیئر کالج۔

☆ بھیونڈی: کارپوریشن کے پرائمری اسکول 32، پرائیویٹ پرائمری اسکول 17، ہائی اسکول 19، اور جونیئر کالج 3، کارپوریشن کے تحت 2 ہائی اسکول بھی جاری ہیں۔

☆ ناگپور: پرائمری اسکول 71 پرائیویٹ ہائی اسکول 28، اور جونیئر کالج 10۔

☆ پونہ: پرائمری اسکول 60، پرائیویٹ ہائی اسکول 24، اور جونیئر کالج 1۔

ہائی اسکولوں کی کارکردگی جانچنے کا ایک پیمانہ ایس ایس سی کے نتائج کو بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں کے نتائج پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔

مارچ 2003 میں 46143 طلبہ و طالبات ایس ایس سی امتحان میں شریک ہوئے اور زبان اول (اردو) کا نتیجہ 92.2 فی صد رہا۔ ایچ ایس سی کے امتحان میں 25973 طلبہ شریک ہوئے اور زبان اول (اردو) کا نتیجہ 91.99 فی صد رہا۔

مارچ 2004 میں ایس ایس سی میں شریک ہونے والے طلبہ کی تعداد 48726 تھی۔ 45600 طلبہ کامیاب ہوئے اور زبان اول (اردو) کا نتیجہ 93 فی صد رہا۔

گذشتہ پندرہ بیس برسوں کا تجزیہ بتاتا ہے کہ ریاست کا ایس ایس سی کا مجموعی نتیجہ پچاس فی صد کے آس پاس ہوتا ہے۔ اردو کے جن مراکز کا تذکرہ کیا گیا وہاں کے بیشتر اسکولوں کے نتائج مجموعی نتیجے سے بیس پچیس فی صد زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ چند سال قبل اردو میڈیم کے طلبہ ایس ایس سی امتحان میں پورے مہاراشٹر میں اول پوزیشن پر آتے رہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امتیازی مقام حاصل کرنے میں اردو میڈیم رکاوٹ نہیں بنتا۔

ادارہ بال بھارتی (پونہ) پوری ریاست کے لیے پہلی سے آٹھویں جماعت کی درسی کتابیں آٹھ زبانوں میں شائع کرتا ہے۔ ریاستی زبان مراٹھی کے بعد اردو ذریعۂ تعلیم کی ہی کتابیں سب سے زیادہ شائع ہوتی ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو درسیات کے بلند معیار کو پورے ملک میں تسلیم کیا گیا ہے۔ ادارۂ بال بھارتی کے ذریعے شائع ہونے والی کتابوں کی تعداد سے اردو ذریعۂ تعلیم کے طلبہ کی تعداد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اردو بال بھارتی زبان اول

جماعت	جماعت
1. ایک لاکھ سرسٹھ ہزار	2. ایک لاکھ چونسٹھ ہزار
3. ایک لاکھ اٹھاون ہزار	4. ایک لاکھ بیالیس ہزار
5. ایک لاکھ تینتیس ہزار	6. ایک لاکھ سترہ ہزار
7. ننانوے ہزار	8. ترسٹھ ہزار

ایس ایس سی بورڈ کی جانب سے شائع ہونے والی اردو زبان کی کتابوں کی تعداد

9. باون ہزار	10. اڑتالیس ہزار
11. بتیس ہزار	12. تیس ہزار

یہ اعداد و شمار کسی حد تک تارک کتب طلبہ کی شرح کا اشاریہ بھی ہیں۔ انگریزی میڈیم کے پانچویں تا دسویں کے طلبہ اردو (مشترکہ کورس) بطور ایک اختیاری مضمون لے سکتے ہیں۔ ان طلبہ کے لیے بھی درسی کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔

حکومت مہاراشٹر کی جانب سے سرکاری سطح پر ہونے والی چوتھی اور ساتویں جماعتوں کے لیے اسکالر شپ امتحان، ایلمنٹری اور انٹر میڈیٹ ڈرائنگ امتحان اور MH-CET کے امتحان کے سوالی پرچے اردو میں بھی فراہم کیے جاتے ہیں۔ جون 2004 سے اردو داں طلبہ کی بی ایڈ کے امتحانی پرچوں کے جوابات اردو میں لکھنے کی سہولت دی گئی ہے۔

مہاراشٹر میں 12 یونیورسٹیاں ہیں جن میں سے 8 یونیورسٹیوں میں اردو میں تحقیق کی سہولت موجود ہے۔ گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن سطح تک اردو پڑھائی کا انتظام کئی کالجوں میں ہے۔ ذیل کی یونیورسٹیوں سے سال رواں میں اردو میں ایم اے کرنے والے طلبہ و طالبات کی تعداد سے اس یونیورسٹی میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کی وسعت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

پونہ یونیورسٹی میں سال اول و دوم کے طلبہ و طالبات کی تعداد 250، مغربی مہاراشٹر یونیورسٹی جلگاؤں 160، امراؤتی یونیورسٹی تقریباً 150، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں 100 اور ناگپور یونیورسٹی میں 35 ہے۔

اردو زبان اور اردو ذریعۂ تعلیم کے فروغ میں مختلف اداروں اور جماعتوں کی انفرادی و اجتماعی کوششوں کا اہم حصہ ہے۔ اس ضمن میں انجمن اسلام، انجمن خیر الاسلام، اعظم کیمپس، اقرا ایجوکیشن سوسائٹی، انجمن اشاعت اسلام ناندیڑ، دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ، تنظیم والدین اردو مدارس پونے، تنظیم

والدین ممبئی، میسکو (MESCO) ممبئی وغیرہ نے انتہائی وقیع خدمات انجام دی ہیں۔ تعلیمی بیداری اور کیریئر گائیڈنس کے سلسلے میں مبارک کاپڑی کے خطبات کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ مختلف شہروں میں انھوں نے جو لکچر دیے ان کی تعداد ہزار سے تجاوز کر چکی ہے۔

اردو زبان کی ترقی، اردو ذریعۂ تعلیم سے پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم و تربیت کی اہمیت اور روایتی و فاصلاتی طرز تعلیم کا فروغ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا خاص مقصد ہے۔ اس یونیورسٹی کی وجہ سے فاصلاتی طرز تعلیم کے ذریعے اردو کی اعلیٰ تعلیم (بی.اے.، ایم.اے.) اور اساتذہ کی تربیت (بی.ایڈ.) کی راہیں ہموار ہوئی ہیں۔ اس یونیورسٹی نے بی.اے.، ایم.اے. اور بی.ایڈ کورس کے مختلف مضامین کے لیے اردو میں بیش قیمت درسی مواد تیار کر کے طلبہ و طالبات کو فراہم کیا ہے۔ اس طرح یہ یونیورسٹی اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کو بیش قیمت مواقع فراہم کر رہی ہے۔ اس یونیورسٹی کے 20 مطالعاتی مراکز (Study Centres) مہاراشٹر میں موجود ہیں۔ ملک کی کسی بھی ریاست میں اتنے مراکز نہیں ہیں۔ جون 2005 کے تعلیمی سال سے ممبرا (ممبئی) میں اس یونیورسٹی کے علاقائی مراکز بھی شروع ہو گئے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کمپیوٹر آگہی پیدا کرنے، اسے عام کرنے، معاون تعلیمی مواد اور اردو سافٹ ویئر تیار کرنے، اردو کی نصابی کتابوں کی تیاری اور ادبی کتابوں کی اشاعت کی کثیر الجہت مہم ہندوستان گیر پیمانے پر شروع کر رکھی ہے۔ کونسل کی یہ سرگرمیاں اردو زبان اور اردو تعلیم کے فروغ میں معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ مہاراشٹر بھی ان اسکیموں سے مستفید ہو رہا ہے اور ریاست میں کونسل کے مختلف مراکز ان اسکیموں کے ذریعے اردو داں طبقے کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

اس سرسری جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراشٹر میں اردو کی صورت حال بہت حوصلہ افزا ہے اور اردو اداروں کی تعداد کے لحاظ سے یہ ریاست ملک کی دوسری تمام ریاستوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ لیکن صرف اداروں کی عددی کثرت پر مطمئن ہو جانا اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ کمیت (Quantity) کبھی بھی کیفیت (Quality) کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ مقابلہ آرائی کے اس دور میں کیفیت ہی کھرا سونا ہے اور اس اعتبار سے اردو والوں کو خود احتسابی کی شدید ضرورت ہے۔ سید حامد نے ہماری ایک بنیادی کمزوری کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "اردو میڈیم اسکول مسلمان ہی کھولتے اور چلاتے ہیں اور ان سے من حیث القوم ادارہ چلانے کی صلاحیت سلب ہو چکی ہے۔ ان کے ادارے خانہ جنگی میں مبتلا رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں معیار کیسے اچھا ہو۔ قصور میڈیم کا نہیں، انتظامیہ کا ہے۔" (اردو دنیا، فروری 2001)۔ ذرا ہم موجودہ تعلیمی حالات پر نظر ڈالیں، ماقبل ابتدائی (Pre Primary) تعلیم سے لے کر یونیورسٹی کی سطح تک بے شمار نجی تعلیمی ادارے کھلتے جا رہے ہیں۔ ان گنت تکنیکی اور مینجمنٹ کورسوں کے ادارے وجود میں آ رہے ہیں۔ ہندوستان میں طلبہ بڑی تعداد میں ہائی اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم کی غرض سے بیرون ملک جا رہے ہیں۔ بیرون ملک کی یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے اس ملک میں تیزی سے اپنے قدم جما رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ اور باصلاحیت افراد کے لیے نئے امکانات پیدا ہو رہے ہیں۔ تعلیم کے اس پھیلاؤ اور ہمہ گیریت میں اردو کے فروغ کے مواقع بھی پوشیدہ ہیں بشرطیکہ ہم اپنے تعلیمی اداروں خصوصاً اعلیٰ تعلیم کے اداروں کو بین الاقوامی معیار سے قریب لاسکیں۔

یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبوں کی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے مضامین کی تدریس کے علاوہ مختلف سمتوں میں طلبہ کی ذہنی تربیت کریں، ان میں علم کا شوق پیدا کریں تاکہ ان میں آہستہ آہستہ ایک علمی شعور پیدا ہو۔ لیکن حقیقت کوئی دوسرا ہی رخ پیش کرتی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں صرف نوٹس لکھانے یا ان کی فوٹو کاپیاں فراہم کرنے کی روایت زور پکڑتی جا رہی ہے۔ طلبہ کا ذوق علمی بھی ان فراہم کردہ نوٹس تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے حالات میں طلبہ میں مطالعے کا شوق اور علمی شعور کیسے پیدا ہوگا۔ اردو تحقیق کی موجودہ صورت بھی امید افزا نہیں ہے اور یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق سے متعلق بے اطمینانی محسوس کی جا رہی ہے۔ ڈاکٹریٹ کی سند بہت سے اسکالر حاصل کر رہے ہیں لیکن شائع ہو کر منظرِ عام پر آنے والے مقالات کی تعداد افسوس ناک حد تک کم ہے۔

فاصلاتی نظامِ تعلیم کی افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن اس طرز تعلیم نے استاد اور طالب علم کے رشتے کو کمزور کر دیا ہے جس کی وجہ سے طلبہ کسی موضوع کے تمام پہلوؤں اور باریکیوں سے واقف نہیں ہو پاتے۔ استاد اور طالب علم کے درمیان رابطے کے فقدان کی وجہ سے طلبہ کی اخلاقی تربیت کے مواقع بھی کم ہوتے جا رہے ہیں۔ غرض اردو ذریعۂ تعلیم کے اداروں میں پائی جانے والی خامیوں کو دور کرنا، جدید زمانے کی رفتار پر نظر رکھتے ہوئے عملی اقدامات کرنا اور مختلف ذرائع سے ملنے والی سہولتوں اور مواقع سے بھرپور فائدہ اٹھانا ہماری اولین ترجیحات ہونی چاہئیں۔

موجودہ دور کی بے یقینی، ذہنی انتشار، انسانی اقدار کا انحطاط، رشتوں

اور تعلقات میں کسی تقدس کا فقدان انسان کو ایک بھیانک انجام کی طرف لے جارہا ہے۔ ایسے حالات میں سب سے بڑی ذمے داری اساتذہ کی ہے کہ وہ اپنے پیشے کے تقدس کو محسوس کریں اور سب مل کر ان رکاوٹوں کو دور کریں جو علم کی روشنی تک پہنچنے میں حائل ہیں۔ ان کے سامنے ایک چیلنج یہ بھی ہے کہ وہ اپنی تدریس کو کس قدر سائنٹفک، آسان اور دلکش بنا سکتے ہیں۔ اساتذہ کا کردار مثالی ہونا چاہیے تاکہ طلبہ ان کی تقلید کرسکیں۔

ایسے خوشحال ماں باپ بھی اردو اور اردو اسکولوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں جو اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں کو کم معیاری سمجھتے ہیں اور انگریزی میڈیم اسکولوں کی طرف دوڑ لگا رہے ہیں۔ اس رجحان کے برے اثرات ہم اپنے شہروں میں دیکھ رہے ہیں۔ ہم اپنے گھروں میں اردو بولیں، بچوں کو اردو پڑھائیں، اردو تعلیم کا ماحول بنائیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہمارے طلبہ دوسرے میڈیم کے طلبہ سے پیچھے رہ جائیں۔

ہمارے بعض تعلیمی ادارے کاروباری طرز پر چلائے جارہے ہیں۔ ایسے منتظمین سے ہم اتنی تو توقع کرسکتے ہیں کہ وہ بنیادی ڈھانچے پر خرچ کریں۔ اچھا تجربہ گاہ اور کمپیوٹر لیب بنائیں، کتب خانے کی جدید کاری کریں، باصلاحیت عملے کا تقرر کریں اور انھیں معقول تنخواہیں دیں۔ جو منتظمین مدرسہ عملہ، سرپرستوں اور طلبہ کا استحصال کررہے ہیں اور اسکول کی فلاح و بہبود سے بے نیاز ہیں ان کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا:

تم سے ٹوٹے گا نہ کبھی شب کی سیاہی کا طلسم

تعلیمی اصلاحات اور اس کے لیے عملی اقدامات کی ایک طویل فہرست پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہاں صرف چند کی نشاندہی کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان پر بھی ایک ساتھ عمل کرنے کی بجائے انھیں منصوبہ بند طریقے سے مرحلہ وار انجام دیا جاسکتا ہے۔ لیکن راہ کی دشواریوں کو بے عملی کے لیے بہانا نہ بنایا جائے۔

☆ آئین کے ذریعے دیے گئے تعلیمی حقوق، سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور انجمنوں کی پالیسیوں اور اسکیموں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

☆ کوئی ایسی تنظیم ہو جو اردو اسکولوں کے مسائل پر بحث کرے اور انھیں حل کرنے کی کوشش کرے۔ نصاب، نصابی کتاب، تدریس، اسکول کے ماحول اور کارکردگی کا احتساب ہوتا رہے۔

☆ نئے اسکول کھولے جائیں، اسکول کے لیے عمارتیں بنائی جائیں۔

باصلاحیت اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔

☆ سماجی بیداری مہم کے ذریعے اسکول میں طلبہ کی تعداد بڑھائی جائے۔ تارک کتب طلبہ کی تعداد کم کرنے کی کوشش کی جائے، تعلیم بالغاں کے مراکز قائم کیے جائیں اور عمومی خواندگی پر توجہ مرکوز کی جائے۔

اس مقالے کے ایک اہم نکتے کی طرف توجہ مبذول کرنا چاہوں گا۔ بدقسمتی سے اردو زبان میں الفاظ سازی اور اصطلاحات سازی کا عمل رک سا گیا ہے۔ یہ جمود اردو زبان کے لیے سم قاتل ہے۔ اردو زبان کو سائنٹفک اور علمی زبان بنانے کے لیے اسے جدید ٹکنالوجی کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ صرف مادری زبان ہونے کا واسطہ اور اردو شعرو ادب کی دلکشی کا حوالہ دے کر نئی نسل کو اردو تعلیم کی طرف راغب نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی انھیں انگریزی اسکولوں کی طرف دوڑ لگانے سے روکا جاسکتا ہے۔ اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی گفتگو، ان کی تحریر و تقریر میں انگریزی الفاظ کی کثرت ہوتی ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے۔ اگر اس کا تدارک نہیں کیا گیا تو انگریزی الفاظ کی کثرت کے پیچھے اردو کا اصلی چہرہ چھپ جائے گا اور یہ دلکش زبان اپنی شناخت کھو دے گی۔ ٹی وی پر بولی جانے والی اردو/ہندی زبان میں انگریزی الفاظ کی کثرت اس زبردست خطرے کا پیش خیمہ ہے۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی نے تعلیم کے شعبے میں بھی انقلاب عظیم برپا کردیا ہے۔ نصاب، تعلیم کے مقاصد، مضامین، درسیات، وسائل تعلیم اور طریقۂ تدریس میں بھی بڑی تبدیلیاں آرہی ہیں۔ اساتذہ، منتظمین مدرسہ اور سرپرستوں کا رول بھی اسی مناسبت سے بدل رہا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "کمپیوٹر عصر حاضر کا جام جم ہے جو بادشاہ کے محل سے نکل کر گلی گلی پہنچ چکا ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے روح عصر میں سرعت، لطافت، وسعت، منفعت وحدت کا ایک ایک خزانہ بھردیا ہے۔" (احمد سجاد "اردو دنیا" جنوری 2000)

غرض انفارمیشن ٹیکنالوجی، عالمیت اور نج کاری کی وجہ سے پوری دنیا میں جو تبدیلیاں آرہی ہیں ان کا باریک بینی سے جائزہ لینا اور ان کے مطابق اپنے نظام تعلیم کو ڈھالنا بہت ضروری ہے۔ یہ عمل مسلسل جاری رہنا چاہیے

دنیا بھر میں تعلیم کے اس پھیلاؤ اور ہمہ گیریت کی وجہ سے باصلاحیت افراد کے لیے نئے نئے امکانات پیدا ہورہے ہیں۔ اگر منصوبہ بندی کی جائے اور اس پر عمل بھی ہو تو اردو تعلیم کا فروغ ہوگا، اردو والوں کے لیے بے شمار مواقع پیدا ہوں گے اور اردو کا رشتہ معاش سے بھی وابستہ ہوسکے گا۔

جدول

Sr. No.	District	Total Population	Literates	%	Muslim Population	Literates	%
1	Nandurbar	13,11,709	603221	45.9	71215	49228	69
2	Dhule	1707947	1040837	60.9	149466	96106	64.2
3	Jalgaon	3682690	2381376	64.6	455288	266342	59.4
4	Buldhana	2232480	1433889	61.4	285387	171053	59.9
5	Akola	1630239	1135245	69.6	296272	195810	66
6	Wasim	1020216	630763	61.8	111863	68666	61.3
7	Amrawati	2607160	1856549	71.2	347250	247398	71.2
8	Vardha	1236736	865556	69.9	47605	34683	72.8
9	Nagpur	4067637	2976205	73.1	296709	221163	74.5
10	Bhandara	1136146	770662	67.8	23324	18400	78.8
11	Gondiya	1200707	808414	67.3	21980	16416	74.5
12	Gad Chiroli	970294	490121	50.5	17341	12539	72.7
13	Chandpur	2071101	1311008	63.3	76050	53968	70.9
14	Autmahal	2458271	1537777	62.5	196909	132310	67.1
15	Nandhade	2876259	1825685	56.5	365081	219289	56.9
16	Hingoli	987160	543309	55.0	103199	57018	55.2
17	Parbhani	1527715	842536	55.1	243935	131773	54
18	Jalna	1612960	870399	53.9	211531	113219	53.5
19	Aurangabad	2697013	1771659	61.1	569516	336925	59.1
20	Nashik	4993796	3126188	62.6	525983	342853	65
21	Thane	8131849	5635799	69.3	880827	595913	67.6
22	Mumbai Sub	8640419	6617264	76.5	1488987	1016459	88.2
23	Mumbai	3338031	2590613	77.06	00	00	00
24	Raigad	00	00	00	00	00	00
25	Pune	7232555	5039290	69.6	452397	316311	69.9
26	Ahmadnagar	4040642	2598597	64.3	264145	175205	66.3
27	Bead	2161250	1241434	57.4	256582	151308	58.9
28	Latur	2080285	1254534	60	292996	165847	56.6
29	Usmanabad	1486586	872022	58.6	151181	87316	57.7
30	Solapur	3849543	2336825	60.7	377579	233015	61.7
31	Satara	2808994	1908947	67.9	125661	90078	71.6
32	Ratnagiri	1696777	1095833	64.5	175672	131022	74.5
33	Sindudurg	868825	612919	70.5	23688	16465	69.5
34	Kolapur	3523162	2364307	67	236875	167669	70.7
35	Sangli	2583524	1717836	66.4	203524	142530	70.0

نوٹ: مندرجہ بالا جدول کے اعداد و شمار مردم شماری کی رپورٹ 2001 سے لیے ماخوذ ہیں۔

574, Belbaugh, Guruwar Ward,
Post- Malegaon-423203
(Maharashtra)

□□□

اسعد فیصل فاروقی

پہلی ہندوستانی سائنس رپورٹ

کسی بھی ملک اور قوم کی سماجی اور اقتصادی ترقی کا انحصار سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی پر ہوتا ہے۔ مختلف ترقی یافتہ ممالک ہر سال اپنے ملک میں ہونے والی ترقی کا جائزہ لیتے ہیں اور اس پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ بعض ترقی پذیر ممالک بھی وقتاً فوقتاً اپنے یہاں ہونے والی سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کی تجزیاتی رپورٹ شائع کرتے ہیں تاکہ ملک کی معاشی حالت اور ترقی میں سائنس اور ٹکنالوجی کے اثرات کا پتا لگایا جاسکے اور مستقبل کے لیے لائحۂ عمل تیار کیا جاسکے۔ لیکن ہندوستان میں اب تک صرف سرکاری ایجنسیوں کے اعداد وشمار اور مختلف مواقع پر کی گئی تحقیقاتی رپورٹیں ہی دستیاب ہیں۔

ہندوستان میں گذشتہ برسوں میں سائنس اور ٹکنالوجی کے مختلف شعبوں میں کافی اہم تحقیقات ہوئی ہیں۔ حال ہی میں جاری کی گئی ''پہلی ہندوستانی سائنس رپورٹ (انڈیا سائنس رپورٹ، آئی ایس آر) اس سمت میں پہلی مثبت کوشش ہے۔ اس رپورٹ کا خاکہ ہندوستانی قومی سائنس اکیڈمی (انسا) نے تیار کیا تھا، جس نے اس رپورٹ کو تیار کرنے کی ذمے داری قومی مرکز برائے تحقیقات عملی معاشیات (NCAER) کو سونپی تھی۔ اس رپورٹ میں جن اہم نکات کو ترجیح دی گئی ہے: سائنسی تعلیم، انسانی وسائل اور سائنس اور ٹکنالوجی کے لیے عوامی رائے۔ یہ کوشش ہندوستان میں سائنس اور ٹکنالوجی نظام کے مختلف پہلوؤں کے کمیت کی پیمائش کے لیے صحیح اصول اور Indicators کی ترقی کے لیے اہم قدم ہے۔

انڈیا سائنس رپورٹ 2005 میں جو نتیجے اخذ کیے گئے ہیں، اصل میں وہ این سی اے ای آر کے ذریعے کیے گئے ایک سروے — نیشنل سائنس سروے 2004 پر مبنی ہیں جس کو 23 ستمبر 2005 کو وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے جاری کیا تھا۔

اس رپورٹ کے مطابق ملک میں 48.07 کروڑ لوگوں نے گریجویشن یا اس سے اعلیٰ ڈگری (ڈپلوما کو چھوڑ کر) حاصل کی ہے اور ان میں سے ہر چوتھے فرد نے سائنس کی تعلیم حاصل کی ہے جس میں 3.92 کروڑ افراد گریجویشن (جن میں سے 27.03 فیصد سائنس اسٹریم سے)، 93 لاکھ پوسٹ گریجویٹ (19.04 فیصد سائنس سے) اور 3 لاکھ ڈاکٹریٹ (ایک تہائی سائنس اسٹریم سے) ہیں۔ بے روزگار گریجویٹ میں سائنسی مضمون کے لوگوں کی تعداد کافی زیادہ (62.08 فیصد) ہے۔ گریجویشن کے بعد آگے تعلیم جاری رکھنے والے طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ 1995-96 میں جہاں یہ تعداد 66 لاکھ تھی وہیں 2004 میں بڑھ کر 98.06 لاکھ ہوگئی ہے۔

گریجویشن کے بعد سائنس پڑھنے والوں کی تعداد 2004 میں 28.04 فیصد سے بڑھ کر 34.06 ہوگئی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس اعداد وشمار میں ''سائنس'' کے تحت آنے والے جملہ اداروں اور مضامین کو شامل کیا گیا ہے جن میں کمپیوٹر سائنس سے لے کر انفارمیشن ٹکنالوجی تک شامل ہے۔ سائنس کی تعلیم حاصل کیے ہوئے صرف 28.08 فیصد نوجوانوں کو ہی حسب لیاقت ملازمت مل پا رہی ہے۔ 33.05 فیصد تو ایسے ہیں جو کارخانوں میں چھوٹی موٹی مزدوری کرنے پر مجبور ہیں۔ 12.02 فیصد سائنس کی تعلیم حاصل کیے ہوئے لوگ کھیتی باڑی یا مچھلی پالن کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ 09.04 فیصد لڑکیاں جنھوں نے سائنس کی تعلیم حاصل کی ہے بے روزگار ہیں۔ حالانکہ اس رپورٹ کے مطابق سائنس کی تعلیم کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھا ہے لیکن رپورٹ کے مطابق اس سے بے روزگاروں کی ایک بڑی فوج بھی تیار ہو رہی ہے۔ رپورٹ کے مطابق سائنس کی تعلیم حاصل کرنے والے 23.06 فیصد نوجوان روزگار نہ ملنے کی وجہ سے بے کار بیٹھے ہوئے ہیں۔ 28.09 انتظامی خدمات میں، 24 فیصد عام ملازمت میں اور 21.03 فیصد دفتروں میں چھوٹی موٹی ملازمت کر رہے ہیں۔

گریجویشن کے بعد انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد جو 1995-96 میں 06.0 فیصد تھی، 2003-4 میں بڑھ کر 11.02 فیصد ہو گئی، انجینئرنگ تعلیم میں طلبہ کی زیادہ تعداد کا اضافہ ہوا جو 1995-2000 کے دوران ہر سال 08.02 فیصد تھی، لیکن 2003-04 میں بڑھ کر 21.09 فیصد ہوگئی۔

اس رپورٹ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب طلبہ کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ حالانکہ ایک تہائی طالب علموں نے کہا کہ انھوں نے سائنس اس لیے نہیں پڑھی کیونکہ اسے

پڑھنے کے لیے ان میں پوری طور سے رغبت پیدا نہیں ہوئی تھی اور 40 فیصد طالب علموں نے کہا کہ کلاس میں طلبہ کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ سمجھ نہیں پاتے تھے کہ آخر کیا پڑھایا جا رہا ہے؟ دوسری طرف جب اساتذہ سے بات کی گئی تو ان میں سے آدھے اساتذہ کا یہ کہنا تھا کہ سائنس کے مضامین پڑھانے کے لیے تجربہ گاہ، کمپیوٹر اور سائنسی آلات کی ضرورت ہوتی ہے اور ادھوری سائنسی تربیت کو ایک بڑا مسئلہ بتایا۔

ہر نسل میں اول درجے کی سائنسی صلاحیتوں کو پیدا کرنے اور فروغ دینے کی شروعات اسکولی سطح سے ہی ہوتی ہے۔ اس لیے اس بات کی بڑی اہمیت ہے کہ ہمارے اسکولوں میں سائنس کس طرح پڑھائی جا رہی ہے اور کیا وہاں پر طلبہ کو سائنسی ماحول دستیاب ہے یا نہیں اس سمت میں خاص طور پر دھیان دینے کی اشد ضرورت ہے۔

جہاں تک سائنس اور ٹکنالوجی میں انسانی وسائل کا سوال ہے۔ اس رپورٹ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ملک میں تقریباً 05.26 کروڑ گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ اور ڈپلوما کیے ہوئے افراد موجود ہیں اگر اس میں سے 1.22 کروڑ گھریلو عورتیں اور بے روزگاروں کی تعداد کو کم کر دیں تو صرف 4.02 کروڑ ایسے افراد بچتے ہیں جو سائنس اور ٹکنالوجی وسائل کی بنیاد ہیں۔ سائنس و ٹکنالوجی انسانی وسائل کے ''کور گروپ'' میں وہ لوگ شامل ہیں جنھوں نے گریجویشن اور ڈپلوما کی ڈگری حاصل کی ہے اور وہ سائنس اور ٹکنالوجی صنعت میں ملازمت کر رہے ہیں اور ان کی تعداد 1.42 کروڑ ہے۔

رپورٹ میں عوامی رائے سے جو نتیجے اخذ کیے گئے ہیں ان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ تین چوتھائی لوگ یہ سوچتے ہیں کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم ضروری ہے ساتھ ہی سائنس اور ٹکنالوجی زندگی کو آرام دہ اور صحت مند بناتی ہے۔ سائنس کے بنیادی تصورات کے بارے میں لوگوں کے علم کی اوسط سطح کافی اونچی ہے۔ 57 فیصد لوگ یہ جانتے ہیں کہ کرۂ ارض کا مرکز گرم ہے اور 86 فیصد کو یہ معلوم ہے کہ جس آکسیجن میں سانس لیتے ہیں وہ درختوں سے ملتی ہے۔

ملک کی 67 فیصد آبادی کا یہ کہنا ہے کہ ٹیلی ویژن ابھی بھی پرائمری معلومات کا ذریعہ ہے اور یہ اخبار کے مقابلے تقریباً 5 گنا زیادہ عوام میں پسند کیا جاتا ہے۔ قریب تین چوتھائی شہری خاندان اور آدھے دیہی خاندان معلومات حاصل کرنے کے لیے ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں۔ خواندہ افراد میں 65 فیصد خبروں اور معلومات کے لیے ٹی وی پر اعتماد کرتے ہیں۔ جب کہ اس کے مقابلے میں اخباروں پر 27 فیصد آبادی بھروسا کرتی ہے۔ دو تہائی آبادی کو سائنس سے متعلق معلومات ٹی وی کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں جب کہ اخباروں سے صرف 8 فیصد لوگوں کو یہ معلومات مل پاتی ہیں۔ تین چوتھائی سے زیادہ لوگ (85 فیصد) ٹیلی ویژن کی خبروں کو حقیقت پر مبنی مانتے ہیں۔

ہندوستان میں لگ بھگ 65 فیصد سائنس اور ٹکنالوجی کی خبریں ٹی وی سے ملتی ہیں جب کہ امریکہ میں اس ذریعے سے صرف 7 فیصد خبریں ملتی ہیں۔ رپورٹ کے مطابق زیادہ تر لوگوں کے لیے ٹیلی ویژن خبروں کا عام ذریعہ ہے۔ اس سے اس ضرورت کا احساس ہوتا ہے کہ ٹیلی ویژن پر نشر کرنے کے لیے اچھے اور معلوماتی سائنسی پروگرام بنانے پر زور دیا جانا چاہیے۔ در اصل سائنس اور ٹکنالوجی سے متعلق اچھے ٹی وی پروگراموں کی کمی ہے۔ رپورٹ سے اس بات کو تقویت فراہم ہوتی ہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ کے لیے ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کا پورا استعمال کیا جائے تاکہ عوام الناس کو مزید فائدہ پہنچ سکے۔

ہندوستان میں صرف 0.2 فیصد آبادی انٹرنیٹ سے مستفید ہو رہی ہے۔ دوسری طرف امریکہ میں سائنس اور ٹکنالوجی کی 44 فیصد سے زیادہ معلومات انٹرنیٹ سے حاصل کی جاتی ہیں۔ ہندوستان کے دیہی اور دور دراز علاقوں میں انٹرنیٹ کے استعمال کو فروغ دینے کی ضرورت ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ دیہی اور دور دراز علاقوں کے لوگ بھی سائنسی معلومات سے فیض یاب ہو سکیں۔

رپورٹ کے مطابق سائنس کی تعلیم کو سماجی و معاشی تنگی کی وجہ سے کمزور طبقے کے لوگ آگے جاری نہیں رکھ پاتے علاوہ ازیں بنیادی سہولیات کی کمی، مستقبل کے سلسلے سے سائنسی مضامین سے ملنے والی سہولیات اور معلومات کا فقدان بھی اس کی اہم وجوہات ہیں۔ رپورٹ کے مطابق شہری طلبہ کے مقابلے دیہی طلبہ آرٹ کے مضامین زیادہ پڑھتے ہیں۔

صحیح اعداد و شمار کی عدم موجودگی میں معنی خیز منصوبے اور لائحۂ عمل تیار کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم نے جو اعداد و شمار جمع کیے ہیں وہ صحیح ہوں تا کہ نتیجے پر پہنچا جا سکے۔ اس زاویۂ نگاہ سے یہ رپورٹ پہلی اور ایک اہم کوشش ہے۔

Editor "Science aur Kainat"(Urdu Monthly)
Allahwali Kothi, Dodhpur,
Civil Line, Aligarh - 202002

□□□

تحریر: اسپردھا
ترجمہ: اظہار احمد ندیم

حکم، میرے آقا

اب وہ آپ کے لیے ہمہ وقت تیار ہے۔ وہ گھر کے کاموں میں مدد سے لے کر آپ کی تفریح کا بھی انتظام کرسکتا ہے۔ اگر گھر اور دفتر میں صفائی کرنے کی آپ کی خواہش نہیں ہے تو یہ صفائی بھی کردے گا۔ ہم بات کررہے ہیں مشینی انسان کی جسے انسانی روبوٹ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ انسانوں کی طرح سارے کام کرسکتے ہیں: صفائی کرنے والوں کی طرح فرش صاف کرسکتے ہیں، دیوار پر چڑھ سکتے ہیں، آپ سے باتیں کرسکتے ہیں اور آپ کی ہدایتوں کے مطابق سامان اٹھا سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کچھ روبوٹ تو ان لوگوں کی بھی مدد کرسکتے ہیں جو اپنا کام خود نہیں کرسکتے۔

یہ تمام روبوٹ گذشتہ دنوں جاپان کے شہر 'ٹوکیو' میں ناظرین کی توجہ کا مرکز بنے۔ دراصل 'ٹوکیو' میں بین الاقوامی سطح پر روبوٹوں کی نمائش منعقد کی گئی تھی جس میں جاپان اور دوسرے ممالک کی 152 کمپنیوں اور 40 اداروں کے تیار کردہ روبوٹوں کی نمائش کا اہتمام کیا تھا۔ اس نمائش کا آغاز 1973 میں ہوا تھا اور اس کے بعد ہر دوسرے سال یہ نمائش منعقد ہوتی ہے۔

اس نمائش میں جس روبوٹ نے سب سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ 'ہتاچی کمپنی' (Hitachi) کے ذریعے تیار کیا گیا روبوٹ ہے۔ اس روبوٹ کی خاصیت یہ ہے کہ وہ حکم کے مطابق سامان اٹھاتا ہے یعنی اب آپ کو مدد کے لیے دوسروں کا محتاج نہیں ہونا پڑے گا۔ یہ روبوٹ آپ کے ہر کام میں آپ کی مدد کرسکتا ہے۔ اگر آپ مصروف ہیں اور کسی چیز کی آپ کو ضرورت ہے تو آپ صرف اس سے کہہ دیجیے، بس پلک جھپکتے ہی وہ آپ کا کام پورا کردے گا۔ تجربہ کار لوگوں کا ماننا ہے کہ انسان کا حکم بجالانے والی یہ مشین جلد ہی پوری دنیا میں سب کی پسندیدہ شے بن جائے گی اور ہر کوئی اسے اپنانا چاہے گا۔

اس نمائش میں ایسے روبوٹوں کو بھی پیش کیا گیا تھا جو کمپنیوں میں مزدوروں کی جگہ لے سکتے ہیں یعنی مستقبل میں مزدوروں کو بے روزگار بنانے والی ایک اور مشین تیار ہے۔ پاسکاوا الیکٹرک کارپوریشن کے مینیجنگ ڈائرکٹر یوشی ہتو سونو ہارا کے مطابق روبوٹ کی مدد سے نہ صرف پیداوار کی کل لاگت میں کمی آئے گی بلکہ ان کا معیار بھی بہتر ہوگا۔ آنے والے دنوں میں طبی سہولیات، صفائی ستھرائی اور تحفظ کے شعبے میں انسانوں کی مدد کرنے والے روبوٹوں کو بھی اس نمائش میں دکھایا گیا۔

سکوبا یونیورسٹی میں "روبوٹ پاورڈ سوٹ" پر تحقیق کررہے یوشی یوکی سنکائی کا خیال ہے یہ فیکٹری اور قدرتی آفات میں امداد اور راحت پہنچانے والوں کی بھاری سامان اٹھانے میں مدد کریں گے۔ ہائی برِڈ اسسٹیو لِمب یعنی ایچ۔اے۔ایل۔ نامی اس روبوٹ سوٹ میں ایسے آلے لگے ہیں جو دماغ سے نکل رہے الیکٹرک نروسگنل کو اس وقت ہی پکڑ لیتے ہیں جب آدمی اپنے جسم کے حصوں کو ہلاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں لگا کمپیوٹر انسانی رفتار کی مدد کے لیے ضروری موٹر چلا دیتا ہے۔ اسے بزرگوں اور معذور لوگوں کی مدد کے لیے بنایا گیا ہے۔ یہ روبوٹ چلنے پھرنے، سیڑھیاں چڑھنے اور وزنی سامانوں کو اٹھانے میں ان کی مدد کرے گا۔ ایک دوسرا جاپانی روبوٹ فارم "تمسک" کا تیار کردہ آئی۔آئی۔ڈی۔سی۔ 01 نامی گھریلو روبوٹ دھول وغیرہ کی بھی صفائی کرتا ہے۔ اگر آپ سوچ رہے ہیں کہ یہ روبوٹ صرف کام کرسکتا ہے تو آپ کا یہ خیال غلط ہے۔ اگر آپ اداس اور بور ہورہے ہوں تو یہ آپ کی تفریح کا انتظام بھی کرسکتا ہے۔ ڈی۔وی۔ڈی۔ فلمیں لگا کر تفریح مہیا کرانے والے روبوٹ کے تو بچے ابھی سے دیوانے ہیں۔

سیکڑوں کی تعداد میں نمائش میں لائے گئے روبوٹوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو روزمرّہ کے کام میں لوگوں کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ الیکٹرونکس سامان بنانے والی کمپنی ہتاچی نے "ای۔ایم۔آئی۔ایس۔ ڈبلیو۔" کے نام کا ایک روبوٹ پیش کیا جو دو پہیوں کے سہارے کہیں بھی آجا سکتا ہے۔ یہ دوسرے کمروں میں رکھے سامان اٹھا کر لا سکتا ہے۔ اس میں ایسے پرزے لگے ہیں جن سے راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو یہ پہچان سکتا ہے یہی نہیں اس میں آواز پہچاننے کی ایسی تکنیک بھی ہے جس کی مدد سے وہ اپنے مالک کی آواز پہچان سکتا ہے۔ 4.2 فٹ کے اس روبوٹ کے بارے میں ہتاچی کا کہنا ہے کہ یہ دنیا کا سب سے تیز چلنے والا روبوٹ ہے جو چھ کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے چل سکتا ہے۔ یہ روبوٹ گاڈزلا (Godzila) کی طرح اپنے پیروں کو آگے بڑھاتا ہے۔ ایک ایسا بھی روبوٹ ہے جو آپ کے گھر میں آنے والے مہمانوں کے لیے بہترین میزبان ثابت ہوسکتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ اسے کس طرح مسکرانا ہے اور کس طرح جھک کر ان کا استقبال کرنا ہے۔

جاپان میں ایک ایسے روبوٹ پر کام چل رہا ہے جو جسم کے اندر کی رگوں کی جراحی میں ڈاکٹروں کی مدد کرے گا۔ اسی نمائش میں ناگویا یونیورسٹی کی ایک تحقیقاتی جماعت نے اس کا ایک نمونہ پیش کیا۔ ''مائکرو سرجری'' نام کے اس روبوٹ کو سرجن کی طرح بنایا گیا ہے جو انسانی پتلے کی بناوٹی رگوں میں داخل ہوتا ہے۔ یہ روبوٹ طب کے طالب علموں اور ڈاکٹروں کو انڈوویسکولر (Endovascular) علاج کرنا سکھاتا ہے۔ اس سے مریض کی رگوں میں ٹیوب ڈال کر آپریشن کرنا بھی سیکھا جا سکتا ہے۔ دوسرے (Stroke) سے متاثر مریضوں کے علاج کے لیے انڈواس کولر علاج بہت مشہور ہو رہا ہے۔ اس کی شہرت کی اہم وجہ اس کے پرانے طریقۂ علاج سے بہتر ہونا ہے۔ پرانے طریقۂ علاج میں مریض کا جسم کھولنا پڑتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس روبوٹ کا استعمال دماغ کی رگوں تک پہنچنے کے لیے پیروں کے خون کی نلیوں میں ٹیوب ڈالنے والے مشکل آپریشن کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس تحقیقاتی ٹیم کی کمپنی ''فین بایو میڈیکل اِنک'' کے مطابق ''وہ ایسی ٹیکنالوجی بنا رہے ہیں جو آپریشن میں مددگار ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے بہتر ماحول بھی سازگار کر سکے۔''

''این۔ای۔سی۔'' کا ''پیپر و'' ٹوکری کی شکل کا ہے جو ہمارے ساتھ کھیل سکتا ہے، ہماری باتوں کا جواب دے سکتا ہے۔ اسے اس انداز سے بنایا گیا ہے کہ یہ چھوٹے بچوں اور بزرگوں کا بہترین ساتھی ثابت ہو سکتا ہے۔ جاپانی کمپنی ''موٹومین'' نے ایک نئی طرح کا روبوٹ بنایا ہے۔ اس کے کئی حصوں سے جڑے اس کے دو ہاتھ ہیں۔ یہ تیز رفتار سے صنعتی پیداوار کا کام کر سکتا ہے۔ یہ روبوٹ ڈھیر ساری باتیں کر سکتا ہے۔ اس میں آٹھ مائکروفون لگے ہیں اور اس میں 655 الفاظ کی شناخت کرنے کی بے مثال صلاحیت موجود ہے۔ اس طرح ''ہیلو کٹی روبوٹ'' باتیں بھی کر سکتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں سی۔ایم۔او۔ایس۔ تکنیک والے کیمرے لگے ہیں، جو یہ بتا سکتا ہے کہ سامنے والا آدمی کتنی دوری پر کھڑا ہے۔

صفائی ستھرائی اور تفریح مہیا کرانے والے روبوٹ کے علاوہ نمائش میں ایک ایسا روبوٹ بھی تھا جو لوگوں کو مشروبات پیش کر رہا تھا۔ ''موٹو مین ڈی۔ اے۔ 20 تا'' اس انسانی روبوٹ نے خوب صورت ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر پلازما اسکرین ہے اور وہ بہترین ''کاک ٹیل'' بنانے میں ماہر ہے۔ یہ امر باعث تعجب ہے کہ کاک ٹیل تیار کرتے وقت یہ ایک بوند بھی نیچے نہیں گرنے دیتا۔ ''بارمین بوٹ پروجیکٹ'' سربراہ کے مطابق موٹومین کو صرف نمائش کے لیے نہیں رکھا گیا ہے بلکہ کئی امریکی ہوٹل اور دوسری جگہوں پر اس روبوٹ کو بار میں بطور بیرا (Serving Boy) رکھنے کے لیے غور کیا جا رہا ہے۔ یہ بار بوائے کبھی بھی بیمار نہیں پڑ سکتے اور نہ ہی ان کے یہاں تھکاوٹ کا مسئلہ ہے۔ ایک الگ قسم کا روبوٹ بھی دیکھنے کو ملا جو موٹا اور ناٹا تھا جس کا نام ''پوری سوئے اِف بوٹ'' تھا اس کی آنکھیں پیلے رنگ کی تھیں۔ اسے خاص طور پر بزرگوں کے ساتھ رہنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ انسانی شکل کا ''ایکٹرائیڈ ڈی۔ای۔آر۔'' چار زبانوں میں لوگوں کے سوالوں کا جواب دیتا ہے اور آپ کو جہاں جانا ہے اس طرف اپنی انگلیوں سے اشارہ کرتا ہے۔

(بشکریہ ''سہارا سے'' نئی دہلی، 17 دسمبر 2005)

□□□

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

اسکول میں ایک ایسا ماحول بنانا جس میں بچوں کی فطری صلاحیتیں آزاد فضا میں نشو ونما پا کر ابھر سکیں، ان کی فطری نشوونما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ اساتذہ کی تربیت ایک خاص نہج پر کی جائے۔ اس کتاب میں انھی امور پر گفتگو کی گئی ہے۔

صفحات: 307، قیمت: -/96 روپے

خواجہ میر درد

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالاتِ زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت: 14 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: ناصرالدین
ترجمہ: خان شاہد وہاب

کم ہوتی بیٹیاں

ھمارا معاشرہ تیزی سے عورتوں کے تئیں بے حسی کا شکار ھوتا جا رھا ھے۔ مادہ جنین کشی کا سلسلہ اسی رفتار سے چلتا رھا تو تخلیق کا بار اٹھانے والی عورتیں ھی نھیں بچیں گی اور پھر زندگی کا پھیہ اپنے محور پر کیسے گھومے گا ؟ اعداد و شمار پر غور کریں تو معلوم ھوتا ھے کہ پھلی مردم شماری میں فی ھزار مردوں پر عورتوں کی تعداد 972تھی جو 2001کی مردم شماری میں گھٹ کر 933ھو گئی ھے۔ بچوں میں جنس کے تناسب کی تازہ ترین صورت حال مزید تشویش ناک ھے۔ اس مضمون میں اسی مسئلے کے سنگین پھلوؤں اور نتائج پر گفتگو کی گئی ھے۔

ذرا سوچیے، اگر 'نوراتری' کے موقع پر 'جمانے'[1] (जिमाना) کے لیے گوشت پوست کی لڑکیوں کی بجائے مورتیوں کا سہارا لینا پڑے تو کیسا لگے گا۔ اگر بیٹیوں کو پیدا نہیں ہونے دینے کا سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو ہوسکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں نوراتری کے موقع پر 'جمانے' کے لیے 'لڑکیوں' کا ایسا ہی متبادل تلاش کرنا پڑے۔ 2001 کی مردم شماری سے یہ پتا چلا ہے کہ ریاست اتر پردیش کی کل آبادی میں قریب توے لاکھ عورتیں کم ہیں۔ ان میں ہندو مردوں کے مقابلے میں اکیلے پچھتر لاکھ تو ہندو عورتیں ہی کم ہیں۔

اتر پردیش میں چھ سال سے کم عمر کے بچوں میں لڑکوں کے مقابلے میں تقریباً چودہ لاکھ لڑکیاں کم ہیں۔ ان بیٹیوں کو یا تو شکمِ مادر میں ہی یا پھر پیدائش کے بعد مار دیا جاتا ہے۔ ان چودہ لاکھ میں اکیلے ہندو فرقے میں بیٹیوں کے مقابلے میں تقریباً پونے بارہ لاکھ بیٹیاں کم ہیں۔ یوپی میں ہندو آبادی میں جنس کا تناسب 894 ہے (یعنی ہر ایک ہزار ہندو مردوں پر 106 عورتیں کم ہیں۔ چھ سال سے کم عمر کے بچوں میں یہی تناسب 911 ہے (یعنی فی ہزار ہندو لڑکوں پر 89 ہندو لڑکیاں کم ہیں)۔ اس سے حالات کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اگر پوری ہندو آبادی کا جائزہ لیا جائے تو 151 ایسے ضلعے ہیں جہاں جنس کا تناسب 850 سے کم ہے۔ اور یو. پی. میں 70 میں سے 27 ضلعے ایسے ہیں جہاں فی ہزار ہندو لڑکوں پر لڑکیاں (بچوں میں جنس کا تناسب) 100 سے 180 تک کی تعداد میں کم ہیں۔ بیٹوں کی آرزو میں ہندو بیٹیوں کے خلاف کھڑے ہونے والوں میں وہ ضلعے شامل ہیں جنھیں ہم ترقی یافتہ اور مالی اعتبار سے مستحکم ضلعے مانتے ہیں۔ مثال کے طور پر سہارن پور (بچوں میں جنس کا تناسب۔ 834)، مظفر نگر (820)، میرٹھ (830)، باغپت (820)، غازی آباد (834)، گوتم بدھ نگر (847)، بلند شہر (855)، علی گڑھ (877)، متھرا (869)، کانپور شہر (863) اور لکھنؤ (909) اس معاملے میں آگے ہیں۔

اگر یہی صورت حال رہی تو کہاں سے ملیں گی نو لڑکیاں، نو دیوی جیسی لڑکیاں، پوجنے اور 'جمانے' کے لیے؟ سماج میں اس کے اثرات نظر آنے لگے ہیں اور لڑکیاں نہیں مل رہی ہیں۔ خاص طور سے لکھنؤ جیسے بڑے شہروں اور مالی اعتبار سے آسودہ کالونیوں میں۔ لوگوں سے بات چیت کرنے پر پتہ چلا ہے کہ پہلے اشٹمی (آٹھویں) کو ہی لڑکیوں کو 'جمایا' جاتا تھا۔ اب ششٹمی (چھٹی) اور سپتمی (ساتویں) کو بھی لڑکیوں کو 'جمایا' جا رہا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اب نو بیٹیاں بڑی مشکل سے مل رہی ہیں اور ان بیٹیوں کو کئی کئی گھروں میں 'جیمنا' ہوتا ہے۔

'نوراتری' کے موقعے پر جب ہم دیوی کے روپوں کی پوجا کر رہے ہوتے ہیں تو ہمیں زندہ 'دیویوں' کی بھی تھوڑی خیر خبر لینی چاہیے۔ ورنہ ہم صرف پاٹھ ہی کرتے رہیں گے..... یا دیوی.... 'نمستیہ نمستیہ نمستیہ نمونمہ۔' اور بیٹیاں اپنی بقا کے لیے جدوجہد کرتی رہیں گے۔

یورپ میں ایک کہاوت مشہور ہے 'بن بیاہے بیٹی مرجائے اور ایکھ کھیت میں کھڑا بکائے'۔ (یعنی بیٹی بغیر شادی کے مر جائے اور گنا کھیت میں ہی فروخت ہو جائے)۔ ان دونوں کو بڑا ہی مبارک سمجھا جاتا ہے۔ صدیوں پرانی اس کہاوت کی جدید شکل تب دیکھنے میں آئی جب 2002 کی دلّی میں ایک آٹو رکشا پر لکھا ہوا تھا۔ 'بری نظر والے تیرے گھر بیٹی جنمے'۔ زبان کا یہ رویہ بتاتا ہے کہ بیٹیاں اب بھی ہمارے لیے غیر مطلوب شے ہیں۔

چند مہینوں پہلے چنڈی گڑھ میں دسویں، بارھویں اور بی.اے. میں پڑھنے والی تین بہنوں نے خودکشی کرلی۔ ایک بیٹے کے ارمان میں تینوں بہنوں کی ماں ایک بار پھر حاملہ تھی۔ والدین کے دلوں میں بیٹے کے شدید ارمان اور اسکول، کالج میں لوگوں کے مذاق سے دل برداشتہ ہوکر تینوں بہنوں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کردیا۔ یہ واقعہ اور اس طرح کے دیگر واقعات ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کے تئیں روز افزوں امتیازی برتاؤ کے گواہ ہیں۔

عورتوں کی پوجا کو دیوتا کی پوجا سمجھنے والا ہندوستانی سماج تیزی سے ایک ایسے سماج میں تبدیل ہوتا جارہا ہے جہاں عورتوں کے خلاف جرائم اور اُن کے تئیں بے حسی عام ہوتی جارہی ہے۔

1991 اور 2001 کی مردم شماری میں جنس کے تناسب میں آئی زبردست گراوٹ اس بات کو درست ٹھہراتی ہے۔

پنجاب، ہریانہ، دلّی جیسی ریاستوں میں روایت، ٹیکنالوجی اور خوش حالی کا مثلث شکمِ مادر میں ہی لڑکیوں کو لقمۂ اجل بنارہا ہے۔

حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ ملک کی نسبتاً زیادہ خوشحال مغربی ریاستوں— پنجاب، ہریانہ، چنڈی گڑھ، ہماچل پردیش، مہاراشٹر، گجرات وغیرہ میں جہاں اقتصادی ترقی کی شرح، خواندگی کی شرح وغیرہ مشرقی ریاستوں کے مقابلے میں کافی زیادہ ہے، لیکن پچھلی دو مردم شماریوں سے یہ بات سامنے آگئی ہے کہ انھی ترقی یافتہ ریاستوں میں جنس کے تناسب میں سے زیادہ کمی واقع ہوئی ہے۔

گذشتہ ایک دہائی میں یہ ریاستیں شکمِ مادر میں ہی بیٹیوں کو قتل کردینے کے معاملے میں سب سے آگے رہی ہیں۔ یہاں خوشحالی اور لڑکیوں کے تناسب میں کمی کا معاملہ ساتھ ساتھ اور متوازی چل رہا ہے۔ یہاں تک کہ ان ریاستوں میں وہ ضلعے جو زیادہ خوشحال ہیں، وہاں مادہ جنین کشی کا تناسب زیادہ ہے۔ مثلاً دلّی میں زیادہ خوشحال علاقے جنوبی دلّی اور مہاراشٹر میں دودھ کے کاروبار کی وجہ سے خوش حال ستارا ضلعے میں جنس کا تناسب ریاست کے دیگر علاقوں کے مقابلے میں زیادہ کم ہوا ہے۔ اس کے برعکس بہار، اُتر پردیش، مغربی بنگال، آندھرا پردیش، تمل ناڈو اور کرناٹک جیسی ریاستیں جو سماجی اور اقتصادی اعتبار سے کم خوش حال ہیں، وہاں پچھلی دو مردم شماریوں کے مطابق جنس کے تناسب میں کم کمی آئی ہے۔

ریاست/مرکز کے زیرِ انتظام علاقے	عام تناسب (1991)	چھ برس کے بچوں میں تناسب (1991)	چھ برس کے بچوں میں تناسب (2001)	کل تبدیلی
پنجاب	857	875	793	-82
دلّی	821	915	865	-50
ہریانہ	861	879	820	-59
ہماچل پردیش	970	951	897	-54
مدھیہ پردیش	920	941	929	-12
مہاراشٹر	922	946	917	-29
بہار	921	953	938	-15
چنڈی گڑھ	773	899	845	-54
گجرات	921	928	878	-50
اتر پردیش	898	927	916	-11
جھارکھنڈ	941	979	966	-13
چھتیس گڑھ	990	984	975	-5
لکش دیپ	947	941	974	+33
کیرالا	1058	958	968	+05
سکّم	875	965	986	+21
تریپورا	950	957	965	+8
میزورم	938	969	971	+02

اقتصادی وسائل کی قلت کے سبب بیٹی کی پیدائش کو بدشگون تصور کرنے والے سماج میں اقتصادی خوش حالی آنے کے بعد بیٹیوں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بعض ماہرین کے نزدیک اس روش کی وجوہات یہ ہیں— اقتصادی خوش حالی کی وجہ سے الٹرا ساؤنڈ کی تکنیک بہت ہی آسانی سے دستیاب ہوگئی ہے جس سے حمل میں ہی جنس کی شناخت کرکے مادہ جنین کشی کا کاروبار تیزی سے پھل پھول رہا ہے۔ اعداد وشمار کے مطابق ہر دس لاکھ مادہ جنین کشی پر 500 کروڑ روپے کا کاروبار ہوتا ہے۔

دوسری جانب اقتصادی خوش حالی کے بعد لوگ عورتوں کو کھیت، کھلیان اور دیگر مقامات پر کام کرنے کی ذمے داری سے آزاد کرکے انھیں

چاردیواری تک محدود کرتے جا رہے ہیں۔ اس صورتحال میں عورتوں پر مرداساس معاشرے کا شکنجہ مزید سخت ہوتا جا رہا ہے۔ اور وہ اپنے وجود اور سماجی حیثیت کی خاطر رحم مادر میں پرورش پانے والی یا پیدا شدہ بیٹیوں کی قربانی کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ بڑھتی ہوئی اقتصادی اور سماجی حیثیت ڈھکی چھپی جاگیردارانہ قدروں کو پھر سے سامنے لانے کا کام کر رہی ہیں۔ ایسے میں قدرتی طور پر ایک سوال یہ بھی اُٹھتا ہے کہ ترقی کے جن مغربی معیاروں کو ہم نے قبول کر رکھا ہے، کیا وہ ہمارے متنوع ہندوستانی سماج کے لیے مناسب ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو شرح ترقی اور مادہ جنین کشی، دونوں میں ساتھ ساتھ اضافہ کیوں ہوتا رہتا؟ اور رحم مادر میں بیٹیوں کو قتل کر دینے والے سماج کو ترقی یافتہ کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟

بیٹی کو قتل کرنے والی یہ مغربی ریاستیں، خاندان کو آگے بڑھانے، جنسی تقاضوں کو پورا کرنے اور مفت کی مزدوری کے لیے پورب کی غریب ریاستوں سے دلہن خرید کر لا رہی ہیں۔ دس، بارہ سے لے کر تیس، چالیس برس کی ان دلہنوں کو کبھی بھی بیوی کا درجہ نہیں مل پاتا ہے۔ یہ دلہنیں محض جنسی کھلونا ہیں جو بیک وقت جملہ برادران خانہ کی جنسی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔

اکثر ان کے شوہروں کی عمر ان سے بیس سال کم اور پچاس سال زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ بیٹا پیدا نہ ہونے کی صورت میں اپنی بیٹی کے ساتھ بار بار فروخت ہونے کا مقدر لیے ان عورتوں کی زندگی کو کیا ایک انسان کی زندگی کہا جا سکتا ہے؟ یہ کیسا سماج ہے، جہاں عہد وسطٰی کی بربریت آج بھی عورتوں کے ساتھ بدستور جاری ہے۔ انسانوں کے ساتھ تجارت کا یہ کھیل آخر کب تک چلتا رہے گا؟

ہمارے ملک میں بیٹیوں کو مختلف وجوہات کے سبب قتل کرنے والے معاشرے کے لیے یہ سوچنے کا آخری موقع ہے۔ اگر ابھی بھی لوگوں کو ہوش نہیں آیا تو —

- اگلے دس برسوں میں پورے ملک میں تخلیق کا بار اُٹھانے والی عمر کی عورتوں کی تعداد میں 1.4 کروڑ کی کمی واقع ہو جائے گی۔
- دو لاکھ تیس ہزار جوانوں کو شادی کے لیے دلہن نہیں ملے گی۔

عورتوں کے تئیں بے حس اور بحران بھرے مستقبل کے لیے کیا ہم تیار ہیں؟ گذشتہ ایک صدی میں لڑکیوں کی تعداد مسلسل کم ہوتی گئی ہے۔ اعداد و شمار ملاحظہ کریں۔

سال	لڑکیوں کی تعداد (فی ہزار لڑکے پر)
2001	933
1999	927
1981	934
1971	930
1961	941
1951	946
1941	945
1931	950
1921	955
1911	964
1901	972

مادہ جنین کشی کے بڑھتے رجحان کی وجوہات کیا ہیں۔ اس کے بارے میں چند ماہرین کا خیال ملاحظہ کیجیے —

سجاش مہندر پورکر (سماجی کارکن، ہماچل پردیش) : اقتصادی خوش حالی کے سبب عورتوں کے رول کو گھر کی چار دیواری تک محدود کیا جا رہا ہے۔ مادہ جنین کشی میں خوشحالی کے تناسب سے ہی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ترقی کا یورپی معیار جنسی امتیاز کو بڑھا رہا ہے۔

ورشا دیش پانڈے :

(قانونی مشیر، پی۔سی۔پی۔این۔ڈی۔ٹی، ستارا، مہاراشٹر) پی۔سی۔پی۔این۔ڈی۔ٹی۔ قانون کو سختی سے نافذ کر کے مادہ جنین کشی میں کمی لائی جا سکتی ہے۔ مہاراشٹر کے ستارا ضلع میں خفیہ کارروائی کر کے حمل میں جنس کی شناخت کرنے والے کئی ڈاکٹروں کو گرفتار کیا گیا ہے جس کا مثبت اثر یہ پڑا ہے کہ تین سال کے اندر ستارا میں جنس کا تناسب 850 سے 900 ہو گیا ہے۔

صابو جارج (سینٹر فار ویمنس ڈیولپمنٹ اسٹڈیز (سی ڈبلو ڈی ایس)، نئی دہلی: شہری معاشرے کی بے رخی کی وجہ سے جنس کے تناسب کا مسئلہ دن بہ دن بڑھتا جا رہا ہے۔ پیدائش سے قبل جنس کی جانچ اور مادہ جنین کشی کا کاروبار پڑھے لکھے ڈاکٹر ہی کر رہے ہیں۔ اگر مادہ جنین کشی اسی رفتار سے جاری رہی اور ایم ٹی پی قانون نیز علاج معالجے کی تکنیک کا یونہی غلط استعمال ہوتا رہا تو ہمیں اسقاط حمل کے حق سے بھی دست بردار ہونا پڑ سکتا ہے۔

مدعو بالا ناتھ (انٹرنیشنل پلانڈ پیرنٹ ہڈ فیڈریشن (آئی پی پی ایف)، نئی دہلی):
جب تک ہم دونوں جنس کے رول میں تبدیلی نہیں لائیں گے تب تک شکم مادر میں یا اُس سے باہر لڑکیوں کے تحفظ کو یقینی بنانا مشکل ہے۔ جنس کی شناخت رمادہ جنین کشی سیدھے سیدھے جنسی امتیاز اور جنسی حقوق سے وابستہ معاملہ ہے۔

سماجی و معاشی اسباب:

- اقتصادی خوش حالی کے سبب الٹرا ساؤنڈ مشین کی آسان دستیابی۔
- بیٹی میں سرمایہ کاری نقصان کا سودا۔ پرورش و پرداخت اور جہیز میں دوہرا خرچ۔ بیٹی بیاہ کے بعد پرائی۔ نہ گھر کے کام کی نہ باہر کے کام کی۔
- بیٹے کو بڑھاپے کا سہارا ماننے کا نظریہ۔ حالانکہ حالیہ برسوں میں یہ نظریہ غلط ثابت ہوا ہے۔
- ماں باپ کی چِتا کو بیٹا آگ دیتا ہے، اس طرح کی مذہبی رسوم۔
- پنجاب، ہریانہ جیسی ریاستوں میں کاشت کاری کے لیے کم ہوتی ہوئی زمینیں۔
- اقتصادی خوش حالی کے سبب عورتوں کو گھر کی چار دیواری تک محدود کرنا۔
- 'ہم دو ہمارے دو' جیسے سرکاری قانون کی وجہ سے بھی مادہ جنین کشی کے معاملات میں اضافہ ہوا ہے۔

نتائج:

1. جنسی غلامی اور جنسی مزدوری کے لیے مجبور، ایک سے زائد مردوں کی جنسی ضرورتوں کو پورا کرنا۔
2. خریدی گئی عورتوں کے بچوں کے حقوق کے مسائل۔
3. عورتوں کے تئیں تشدد میں اضافہ۔
4. زنا بالجبر کے واقعات میں اضافہ۔
5. جنسی رجحان میں تبدیلی، ہم جنسیت کو فروغ۔
6. بیمار، بوڑھوں اور بچوں کی دیکھ بھال اور نرسنگ کے مسائل۔
7. ایچ۔ آئی۔ وی رایڈس کے خطرے میں اضافہ۔
8. بیٹے کی خواہش میں بار بار اسقاط حمل کرانے سے عورتوں کی تولیدی صحت میں گراوٹ۔
9. زچہ کی شرح اموات میں اضافہ۔
10. شرح تولید میں کمی۔

شکم مادر میں جنس کی جانچ پر روک لگانے والا قانون ترمیم شدہ شکل میں پی سی پی این ڈی ٹی 2002 کے نام سے 14 فروری 2003 کو پورے ملک میں نافذ ہو گیا ہے۔

پی سی پی این ڈی ٹی قانون 2002: خاص باتیں۔

- جنس کی شناخت کے لیے کی جانے والی جانچ کے دائرہ کار میں حمل کے لڑکے یا لڑکی میں تبدیل ہونے کے پہلے اور بعد کے دونوں مرحلوں کو شامل کیا گیا ہے۔
- الٹرا ساؤنڈ مشین کا اندراج اور جانچ کا ثبوت رکھا جائے۔
- چلتی پھرتی الٹرا ساؤنڈ مشین پر کنٹرول۔
- قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو پانچ سال کی قید اور ایک لاکھ روپئے جرمانے کے ساتھ مشین ضبط۔
- جنس کی شناخت کے لیے جانے والی ماں بے قصور۔
- حمل کے ان حالات کا ذکر جس میں الٹرا ساؤنڈ کیا جانا ضروری ہے۔
- قانون کی خلاف ورزی کی حالت میں شکایت کہاں اور کیسے کی جائے اس کی جانکاری۔
- ریاستی سطح پر کثیر ارکان پر مشتمل افسروں کی ٹیم جس میں عورتوں کی تنظیم کے نمائندے کی شمولیت، ساتھ ساتھ قانون۔
- سول عدالت کے اختیارات والے افسروں کی تقرری۔
- پولس کی مداخلت سے آزاد قانون۔

(1) نوٹ: 'جمانا':۔ ہندوؤں کے یہاں لڑکیوں کو 'جمانے' کی رسم کافی عام ہے خاص طور سے شمالی اور مشرقی ہندوستان میں۔ اس میں کم از کم نو (یہ تعداد گیارہ، اکیس، اکیاون وغیرہ بھی ہوسکتی ہے) ایسی لڑکیوں کی، جو ابھی بالغ نہیں ہوئی ہوں، پوجا کی جاتی ہے اور انھیں پر تکلف کھانا کھلایا جاتا ہے۔ ان لڑکیوں کو شِو (بھگوان شنکر) کی زوجہ پاروتی جی کے بال رُوپ (بچپن) کی علامت سمجھ کر پوجا کی جاتی ہے۔ پاروتی اپنے بچپن میں بہت برت (روزہ) رکھتی تھیں اور پتے کھا کر اپنا برت توڑتی تھیں۔ بعد میں انھوں نے پتوں کا استعمال بھی چھوڑ دیا تھا، اسی لیے انھیں اَپرنا کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ شوراتری اور نوراتری کے موقعے پر لڑکیوں کو 'جمانے' کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ ویسے کسی بھی اہم مذہبی تقریب کے موقعے پر اس رسم کی ادائیگی ہندوؤں میں مبارک تصور کی جاتی ہے۔

(بشکریہ "ہندوستان" نئی دہلی، 9 ر اکتوبر 2005)

□□□

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فاخر شہیر عباسی

اقتدار کی منتقلی

1857 میں برطانوی حکومت کو ہندوستان سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش ناکام ہوگئی لیکن آخرکار 1947 میں آزادی مل گئی۔ نوے برسوں کے اس درمیانی وقفے میں سیاسی میدان میں متعدد تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اور یہ تبدیلیاں اس قدر اہم تھیں کہ ان میں سے ہر ایک کو بجا طور پر ایک اہم موڑ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام یا 1906 میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام، 1905 میں بنگال کی تقسیم اور 1911 میں اس کی منسوخی، 1916 کا لکھنؤ معاہدہ یا 1919 میں جلیاں والا باغ کا قتل عام، 1921 میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں چلائی جانے والی عدم تعاون کی تحریک یا پھر 1922 میں چوری چورا کے واقعے کے بعد اس سے علاحدگی، 1930 کا نمک ستیہ گرہ، ریاستوں میں کانگریسی حکومتوں کا قیام اور پیر پور کی ''عوام رابطہ'' تحریک، دوسری عالمی جنگ کے دوران نیتا جی سبھاش چندر بوس کا جرمنی بھاگ جانا اور آزاد ہند حکومت کا قیام، 42-1941 میں جنوب مشرقی ایشیا سے انگریز فوجوں کا اخراج، یا 1942 میں بھارت چھوڑو تحریک کے بعد کرپس مشن کی ناکامی، 1943 میں انڈین نیشنل آرمی کا امپھال پر حملہ کرنا اور 1944 میں کوہیما کی لڑائی، رائل انڈین نیوی (RIN) کی بغاوت، یا 1947 میں آزاد ہند ایکٹ۔

مختلف مورخین نے ان واقعات میں سے ہر ایک کو ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم موڑ تسلیم کیا ہے۔ جدید عہد کا ایک بے حد اہم واقعہ 1942 کی انگریزوں بھارت چھوڑو تحریک تھی، جسے ہندوستان کی انگریز حکومت نے ''شورش'' کا نام دیا تھا۔ تاریخی اعتبار سے اس بغاوت کی ابتدا کو ماضی کی سماجی اصلاح کی تحریکات میں تلاش کیا جا سکتا ہے جسے اولوالعزم شخصیتوں جیسے راجا رام موہن رائے اور ان کے معاصرین و جانشینوں نے ہندوستان کے مختلف حصوں میں شروع کیا تھا۔ ان میں آر۔ جی۔ بھنڈارکر، جسٹس رانا ڈے، نارائن چندورکر، تلنگ، آگرکر، گوپال کرشن گوکھلے، دادا بھائی نوروجی، اور دیگر دانشور جیسے سوامی دیانند، رام کرشن پرم ہنس اور سوامی وویکانند شامل تھے۔ درحقیقت ان تمام لوگوں نے ہندوستانی عوام کو ازسرنو بیدار کرنے کے لیے بھرپور تعاون دیا۔ یہی کام ممتاز ہندوستانیوں کے ذریعے نکالے گئے اخبارات نے بھی کیا۔ 1880 میں البرٹ بل کی مخالفت کے نتیجے میں 1883 میں کلکتہ میں انڈین نیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا۔

یہ ہندوستان میں دانشورانہ جوش کا عہد تھا۔ بہت سے رہنما تھیوسوفیکل تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ 1884 میں منعقدہ تھیوسوفیکل سوسائٹی کے سالانہ اجلاس میں اس خیال پر بحث کی گئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ دسمبر 1885 میں تمام ہندوستان کے دانشوران پونہ میں جمع ہوں جہاں پر اس خیال کو عمل میں لانے کے لیے ایک تنظیم کا قیام کیا جائے گا۔ طاعون کی وجہ سے یہ اجلاس بمبئی منتقل کر دیا گیا اور وہاں پر جس تنظیم کا جنم ہوا وہ تھی انڈین نیشنل کانگریس۔

منصوبے کے مطابق 72 نمائندوں کا ایک وفد 28 دسمبر 1885 کو گوالیا ٹینک روڈ بمبئی کے ایک ہال میں جمع ہوا جس میں اے.او. ہیوم بھی شامل تھے جنھیں کانگریس کا بابائے آدم (Father of the Congress) کہا جاتا ہے۔

کانگریس کے اس پہلے اجلاس میں جو نو قرار دادیں پیش کی گئیں ان میں ایک رائل کمیشن کے ذریعے ہندوستانی انتظامیہ کی کارکردگی کا معائنہ، انڈین کونسل کی برخاستگی، منتخب ممبران کا لجسلیٹو کونسل میں داخلے کی اجازت، آئی.سی.ایس کے لیے بیک وقت امتحان اور فوجی اخراجات وغیرہ مطالبات شامل تھے۔

اگلے برس، کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا جس میں 434 نمائندوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس کے صدر دادا بھائی نوروجی نے اعلان کیا کہ کانگریس کو صرف ان سیاسی معاملات کو انجام دینا چاہیے جن پر تمام ہندوستانی متفق ہوں۔ وائسرائے نے اجلاس کی سیاسی نوعیت پر کوئی توجہ نہیں دی اور ان کا خیر مقدم عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ دارالحکومت میں باعزت ملاقاتیوں کی طرح کیا۔ اگلے دو برسوں میں کانگریس نے ہندوستان کے سبھی حصوں میں جوشیلا ردعمل پیدا کر دیا۔ کانگریس کی بڑھتی ہوئی خود اعتمادی اور مطالبات سے عاجز آ کر لارڈ ڈفرن (Lord Dufferin) نے 1888 میں بے رحمانہ رویہ اختیار کیا۔ اس نے کانگریس کے حامیوں کو ایک ''خردبینی اقلیت'' قرار دیا۔ حکومت ہند کے ذریعے نظر انداز کیے جانے کے بعد، کانگریس نے برطانیہ کا رخ کیا اور چارلس براڈلاف

(Charles Bradlaugh) اور ہنری کاٹن (Henry Cotton) کو ہندوستانی اصلاحات میں دلچسپی لینے پر مجبور کیا۔ اس کے نتیجے میں 1892 میں کونسل ایکٹ منظور ہوا۔ یہ ایک فریب تھا۔ بنیادی منصوبہ، آزاد خیال عقیدے اور نیشنلزم کے بڑھتے ہوئے دھارے دونوں سطحوں پر کانگریس کو علاحدہ رکھنا تھا۔

اسی دوران، مسلمانوں کے تئیں انگریز حکومت کی پالیسی میں ایک فطری تبدیلی آ گئی تھی۔ جب کہ ایلن بورو (Ellenborough) نے 1843 میں یہ اعلان کیا تھا کہ ''میں اس خیال سے اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا ہوں کہ مسلمان بنیادی طور سے ہمارے دشمن ہیں، اور ہماری پالیسی ہندوؤں کو ہم آہنگ کرنا ہے''۔ یہ صورت حال اب تبدیل ہو گئی تھی کیونکہ ہندو، جنھیں حکمرانوں کی اعانت حاصل تھی، اب انگریزوں کے خلاف منظم ہو رہے تھے۔ پھر انگریزوں نے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی ایک سوچی سمجھی پالیسی اختیار کی۔ اس باعث نزاع پالیسی پر بڑے استقلال کے ساتھ عمل کیا گیا۔ ایک مسلم محب قوم سرسید احمد خاں، جن کا خیال تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں، ان کے دل پر یہ خوف نقش کر دیا گیا کہ ہندوؤں کا بڑا طبقہ اقلیتی طبقے کے مسلمانوں کے مفاد کو کچل دے گا۔ 1875 سے 1899 تک محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے پرنسپل کے عہدے پر فائز رہنے والے مسٹر بیک (Mr. Beck) نے ایک پروپیگنڈا پھیلایا جس کے نتیجے میں فرقہ وارانہ نمائندگی یا مسلمانوں کے لیے علاحدہ انتخابات کی مانگ کی گئی۔

حکمراں طبقے کی مخالفت کے لیے مختلف عناصر جمع ہو گئے تھے۔ 1896 میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ 1897 میں ہونے والی قحط سالی سے چالیس لاکھ افراد متاثر ہوئے۔ اس کے علاوہ زلزلے، لڑائیاں اور زیادتیاں بھی ہوئیں۔ جیسا کہ رانا ڈے نے کہا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طاعون کی سبھی سات وبائیں ہندوستان پر مسلط کر دی گئی تھیں۔ راحت رسانی سے متعلق سرکاری مشینری کی رفتار نہایت سست تھی۔ غریب کسانوں سے جبراً وصول کی جانے والی مال گزاری کی وجہ سے مفلسی بہت بڑھ گئی تھی۔ لوگ مشتعل ہو گئے تھے۔ انڈین سول سروس کے ایک افسر اور اس کے ساتھی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ تکلیف کم کرنے کے لیے لوگوں کے ذریعے کیے گئے اقدام پر انھیں زیادتیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تلک نے، جس پر اپنے اخبار ہند کیسری کے ذریعے حکومت کے خلاف سازش پھیلانے کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا، یہ اعلان کیا کہ ''ہماری زندگی میں ایسا وقت آ گیا ہے کہ اب ہم صرف اپنے ذمے دار نہیں ہیں، بلکہ ہمیں اپنے ساتھیوں کے نمائندوں کی حیثیت سے بھی کام کرنا ہوگا۔''

تلک کو 1897 میں اٹھارہ مہینوں کی قید با مشقت کی سزا سنا دی گئی۔ یہ ہندوستان میں اپنی قسم کی پہلی سزا تھی۔ یہاں سے آرام کرسی والی سربراہی کا خاتمہ ہو گیا۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ ہونے والے برے برتاؤ نے، جس کے خلاف گاندھی جی ستیہ گرہ کے اپنے نئے ہتھیار کے ساتھ لڑ رہے تھے، ہندوستانی لوگوں کو شدید غم و غصے میں مبتلا کر دیا تھا۔

ہندوستان کے آخری عظیم وائسرائے کرزن نے قوم پرست جذبے کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ 1900 میں اس نے ہندوستان کے معتمد مملکت (Secretary of State) کو لکھا تھا ''میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس روبہ زوال ہے اور ہندوستان میں میرے عظیم مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں اس کے پر امن خاتمے کی اعانت کروں۔ حالانکہ حالات نہایت ناسازگار ہو گئے تھے لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

اس میں کچھ تعجب کی بات نہیں کہ کانگریس کے نوجوان گروہ نے، جسے عام طور سے لال، بال، پال (لالہ لاجپت رائے، بال گنگا دھر تلک، اور بپن چندر پال) کے گروہ کے نام سے جانا جاتا تھا، پرانے رہنماؤں کے بر خلاف بغاوت کر دی تھی اور پارلیمنٹ میں درخواست دینے کا پروگرام ترک کرنے نیز تلک کے نعرے ''سوراج میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے لے کر رہوں گا'' کو اختیار کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس نعرے کی گونج پورے ملک میں سنائی دے رہی تھی اور لوگ حرکت میں آ گئے تھے۔

لارڈ کرزن کا سب سے اہم سیاسی عمل بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کرنا تھا، (الف) مغربی بنگال، جس کی دارالحکومت کلکتہ تھی اور غالب طور سے ہندو ریاست تھی اور (ب) مشرقی بنگال، جس کی دارالحکومت ڈھاکہ میں تھی اور یہ بنیادی طور پر ایک مسلم علاقہ تھا۔ یہ تقسیم ہندوستان میں بے اطمینانی کی واحد سب سے بڑی وجہ تھی۔ اس نے ہر نسل اور طبقے کے لوگوں کو فعال کر دیا۔ مخالفت اس قدر شدید تھی کہ کرزن کو بذات خود ڈھاکہ جا کر ریاست کی تقسیم کے مقصد کی وضاحت کرنی پڑی۔ اس نے کہا کہ اس سے نہ صرف یہ کہ بنگال انتظامیہ کو آسانی ہوگی بلکہ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ایک ایسی ریاست ہو جہاں اسلام اور اس کے پیروؤں کو بالا دستی حاصل ہو۔ نواب سلیم اللہ خاں کو، جو کہ اس تقسیم کے خلاف تھے، ایک لاکھ روپے کا قرض عطا کر کے رضامند کر لیا گیا۔ حالانکہ تقسیم میں نواب کی حمایت کو عام منظوری قطعی حاصل نہیں تھی۔ 1906 میں نواب زادہ عتیق اللہ خاں نے کانگریس کے اجلاس میں کہا تھا: ''میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ بالکل درست نہیں ہے کہ مشرقی بنگال کے

مسلمان تقسیم کے حق میں ہیں۔ اصل میں حقیقت یہ ہے کہ محض چند سرکردہ مسلمانوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے اس عمل کی حمایت کی ہے۔''

تقسیم بنگال کے خلاف ہونے والے مظاہرے میں سودیشی تحریک کے شامل ہو جانے سے اور بھی تیزی سے اضافہ ہوا۔ یہ قومی جذبے کے لیے ایک نقطۂ ارتکاز بن گیا۔ سودیشی تحریک کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ملک میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی اور نیشنلزم کے دو اسکولوں کا جنم ہوا، جو خود انحصاری اور خود مختاری سے کام کرنے کے اپنے عقیدے کے ذریعے نمایاں تھا۔ ساورکر اور شیام جی ورما جیسے ملک بدر لوگوں کی ایما پر نراجیوں نے حکمرانوں کے خلاف دہشت گردی کی پر تشدد تحریک شروع کر دی۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں، اور یہاں تک کہ لندن میں ہونے والے قتل کے واقعات نے حکمرانوں کو ایک نئی صورتحال سے دو چار کر دیا۔ اب حکمرانوں نے نیشنلسٹ گروہوں کے درمیان اختلاف کا بیج بویا۔ آغا خاں کی سربراہی میں ایک وفد کو یکم اکتوبر 1906 کو وائسرائے سے ملاقات کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔ انھوں نے ایک علاحدہ فرقہ وارانہ انتخاب کے ذریعے اپنے نمائندے منتخب کر کے بھیجنے کے اپنے حق کی مانگ رکھی۔ اگلے چند ہفتوں کے اندر ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا جس میں آغا خاں کو مستقل صدر کی حیثیت دی گئی۔ یہ سب کچھ انگریز حکمرانوں کے منصوبے کے مطابق تھا۔

اسی دوران، سودیشی کے حق میں انگریزی سامانوں کے بائیکاٹ، حکمراں طبقے کی اعلانیہ نافرمانی اور برطانوی نوآبادیوں میں موجود خود اختیاری طرز کا حکومتی نظام متعارف کرنے کے مطالبے سے ہندوستان میں قوم پرست گروہوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ جو دو گروہ ابھر کر سامنے آئے انھیں اعتدال پسند اور شدت پسند کہا جاتا تھا۔ شدت پسندوں نے بم سازی کے طریقے سیکھ لیے تھے۔ دوسری جانب حکومت نے بھی تشدد اور زیادتی کا معرکہ چھیڑ رکھا تھا۔ انگریز افسران کے قتل میں اضافے کے ساتھ ہی تشدد میں بھی مزید اضافہ ہوا۔ لیکن جب جبر و تشدد سے حالات سازگار نہیں ہوئے تو انگریز حکومت نے 1909 میں منٹو مارلے اصلاحات (Minto Morley Reforms) کے ذریعے عوام کے خیالات کو بدلنے کی ضرورت محسوس کی۔

حالانکہ، نہ تو جبری اقدام اور نہ ہی 1909 کے منٹو مارلے اصلاحات اس طوفان کو روکنے میں کامیاب ہو سکے۔ انتہا پسندوں کے ذریعے سیاسی قتل کے واقعات میں شدت آ گئی تھی۔ بڑی تعداد میں مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے، انگریزوں نے سیاسی طور پر گرم کلکتہ سے اپنی دارالحکومت دہلی میں منتقل کر دی، جو کہ کئی سلطنتوں کا پایۂ تخت رہ چکا تھا۔ تقسیم بنگال کی منسوخی لارڈ کرزن کے ذریعے شروع کی گئی پالیسی کی شکست تھی۔ دسمبر 1911 میں جب وائسرائے ہارڈنگ ایک ہاتھی پر سوار ہو کر دہلی میں داخل ہوا تو اس پر ایک بم پھینکا گیا۔ اس کا ایک ملازم مارا گیا اور وائسرائے بذات خود زخمی ہو گیا۔

1909 کے اصلاحات محض ایک حسد انگیز اقدام ثابت ہوئے جس کا مقصد فرقہ وارانہ انتخابات کا نظام متعارف کرنا اور قوم پرست گروہوں میں رخنہ ڈالنا تھا۔ کسی طرح پہلی عالمی جنگ ایک نیا عنصر لے کر آئی۔ 1916 میں کانگریس اور لیگ میں مصالحت ہو گئی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ لکھنؤ معاہدے کو بروئے کار لانے میں محمد علی جناح نے بے حد اہم کردار ادا کیا تھا، جو اس وقت ایک سخت قوم پرست تھے۔ جس وقت کانگریس اور لیگ میں مصالحت ہو رہی تھی، اس وقت انقلابی تحریک پہلے ہی شباب پر پہنچ چکی تھی۔ انتہا پسندوں کا ماننا تھا کہ برطانیہ کی پریشانی (پہلی عالمی جنگ) ان کے لیے ایک موقع ہو سکتا ہے۔ یورپ اور امریکہ سے سرگرم عمل غدر پارٹی نے ہندوستان میں انقلابیوں کے کاموں کی تائید کی۔

اسی دوران میں، ہندوستانیوں کی ایک بڑی جماعت نے پوری دلجمعی کے ساتھ جنگ میں انگریزوں کا تعاون کیا۔ ان سب کو جنگ ختم ہونے کے بعد ہوم رول کی امید تھی۔ مسلمانوں کے درمیان قوم پرستی کا ایک نیا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا محرک کسی نہ کسی طرح سے مولانا ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' تھا، جو حالانکہ 1912 میں نکلنا شروع ہوا تھا، لیکن جنگ کے دوران اس کی تعداد اشاعت 26,000 تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں تک کہ لکھنؤ معاہدے میں کانگریس نے بھی ہندوستان کی خود مختاری کے خیال پر مسلم لیگ کی حمایت کو سراہا اور جس کے نتیجے میں آغا خاں نے مسلم لیگ کے مستقل صدر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

جنوبی افریقہ میں ٹالسٹائے کی مدد سے ستیہ گرہ کی اپنی شاندار کامیابی کے ساتھ، گاندھی 1915 میں ہندوستان واپس لوٹے۔ 1916 تک ان کا قد و قامت بلند ہونا شروع گیا تھا۔ 1917 میں انھوں نے بہار کے چمپارن علاقے کے کسانوں کو درپیش مسائل میں ان کی مدد کی۔ انھوں نے فوجوں کی بھرتی میں انگریزوں کی اس امید کے ساتھ مدد کی کہ ہندوستان کی قربانیوں کے بعد برطانیہ کا دل بدل جائے گا۔ لیکن ان کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مانٹیگ چیمسفرڈ اصلاحات نے انھیں مایوس کر دیا۔ آزادی کی جدوجہد کو روکنے کے خیال سے رولیٹ ایکٹ نافذ کیا گیا۔ اور جب 13 اپریل 1919 کو بیساکھی کے دن احتجاج کے لیے سیکڑوں نہتے مرد، عورتیں اور بچے امرتسر کے جلیاں والا باغ میں جمع ہوئے تو ان پر چاروں طرف سے گولیوں کی بارش کی

گئی جس میں 379 لوگ مارے گئے اور 1200 زخمی ہوئے۔

قبل اس کے کہ ہنٹر انکوائری کمیٹی کی رپورٹ سامنے آتی، حکومت نے گنہگار افسران کے دفاع کے لیے ایک قانون پاس کر دیا۔ گاندھی جی کو زبردست صدمہ پہنچا۔ انھوں نے کہا ''ایسی حکومت کے لیے نہ تو میرے دل میں کوئی احترام ہے اور نہ ہی عقیدت جو بد اخلاقی کا دفاع کرنے کے لیے غلطیوں پر غلطیاں کیے جا رہی ہے۔'' اب ہندوستان نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ گاندھی جی ایک انقلابی بن گئے۔ لیکن اس قسم کے جو کسی نے پہلے نہیں دیکھا۔ انھوں نے تحریک کی نوعیت یکسر تبدیل کر دی۔ انھوں نے اس کی بنیادوں کو وسیع کیا اور اس میں ہر طبقے کے مردوں، عورتوں اور یہاں تک کہ بچوں کو بھی شامل کیا۔ اور کانگریس کی ممبر شپ کے لیے گاندھی نے جو فیس متعین کی وہ تھی چار آنے سالانہ۔ مہاتما گاندھی نے سبھی لوگوں کو ملک کی آزادی کے کام کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ ایک غریب ترین آدمی کی طرح لباس پہنے ہوئے، اس معمولی سے آدمی نے تاریخ کی سب سے طاقتور سلطنت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں، ایک ایسی سلطنت جو پوری دنیا کے ایک چوتھائی حصے پر محیط تھی اور جس میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا۔ کانگریس کے ذریعے، گاندھی جی کی سربراہی میں چلائی جانے والی پہلی عظیم تحریک عدم تعاون کی تحریک تھی جس میں قانون ساز مجالس، اسکولوں اور عدلیہ وغیرہ کا بائیکاٹ کیا گیا اور خطابات واپس کرنے کے مطالبے کیے گئے۔ کانگریس کا مقصد قانون کے مطابق اور پر امن ستیہ گرہ کے ذریعے سوراج حاصل کرنا تھا۔ تقریباً 30,000 لوگوں نے گرفتاریاں پیش کیں۔ تمام جیلیں بھر گئیں۔ ترکی کے خلیفہ کی برطرفی پر مسلمانوں نے خلافت تحریک کا آغاز کیا جو عدم تعاون کی تحریک کے ساتھ ضم ہو گئی۔ اکالی بھی اس میں شامل ہو گئے۔ 1921 میں کانگریس کے احمد آباد اجلاس نے مہاتما گاندھی کو قومی تحریک کی رہنمائی کرنے کا مکمل اختیار سونپ دیا۔ گاندھی جی نے سول نافرمانی تحریک کو پر امن طریقے سے چلانے کی اجازت دی تھی۔ جب چوری چورا میں دو درجن سپاہیوں کا قتل ہوا اور ایک بھیڑ کے ذریعے پولیس تھانے کو نذر آتش کر دیا گیا تو گاندھی جی نے اسے نفرت کی ایک علامت کے طور پر دیکھا جو اپنی جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ انھوں نے تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ اعتدال پسندوں کے ذریعے سوراج پارٹی کا قیام عمل میں آیا جنھوں نے مانٹیگ چیمسفرڈ اصلاحات کے نتیجے میں ہونے والے اسمبلی انتخابات میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ اب ایک بار پھر حکمرانوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بد امنی پھیلانا شروع کیا۔ تحریک کو بے اثر کرنے کے لیے انگریز حکمرانوں نے فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دی۔ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کے نتیجے میں 1924 میں مسلم لیگ کا دوبارہ احیا ہوا۔

مانٹیگ چیمسفرڈ اصلاحات کے منصوبوں میں ایک یہ بھی تھا کہ ہر دس سال پر ان اصلاحات کے نتائج کی جانچ کے لیے ایک رائل کمیشن مقرر کیا جائے گا۔ 1927 میں حکومت نے سائمن کمیشن کا تقرر کیا۔ چونکہ یہ کمیشن مکمل طور سے انگریز ممبران پر مشتمل تھا، قوم پرستوں نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ پورے ملک میں لوگوں نے ''سائمن واپس جاؤ'' کے نعرے لگائے۔ ان پر جبر و تشدد کیا گیا۔ یہاں تک کہ لالہ لاجپت رائے جیسے معروف رہنما کو بھی پولیس نے اس قدر بے رحمی سے مارا کہ ان کی موت ہو گئی۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ نے کئی پارٹیوں کو ایک ساتھ لا کھڑا کیا۔ اور 1928 میں موتی لال نہرو کی سر پرستی میں ہونے والی کل جماعتی کانفرنس نے فوری طور پر صوبائی خود مختاری کا مطالبہ پیش کیا۔ اسی دوران صنعتی بے چینی اور تشدد کے واقعات بھی پیش آئے اور میرٹھ، کاکوری اور لاہور کی سازشوں وغیرہ کے معاملات میں سزائیں بھی دی گئیں۔ کانگریس اس شرط پر ہندوستان کے لیے صوبائی خود مختار حیثیت کو قبول کرنے پر رضامند ہوئی کہ یہ دسمبر 1930 کے آخر تک عطا کر دیا جائے۔ قبل اس کے کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ جاری کی جاتی، 1930 میں برطانیہ میں ایک مزدور جماعت اقتدار میں آئی۔ وائسرائے نے اپنی گھریلو حکومت سے رابطہ کرنے کے بعد یہ اعلان کیا کہ ''ہندوستان کی آئینی ترقی کا فطری ما حصل صوبائی خود مختار حیثیت کا حصول ہے''۔ حالانکہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی معاہدہ ممکن نہ ہو سکا، اور مسلم لیگ نے ایک کانفرنس منعقد کی جس میں محمد علی جناح نے اپنا ''چودہ نکاتی'' فارمولا تشکیل دیا۔

اسی درمیان میں، لاہور میں راوی کے کنارے جواہر لال نہرو کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں کانگریس نے مکمل آزادی کے اپنے مقصد کا اعلان کیا۔ دسمبر 1929 کے آخری دن جواہر لال نہرو نے ہندوستان کا قومی جھنڈا لہرایا۔ چھبیس دنوں کے بعد، 26 جنوری 1930 کو پورے ہندوستان میں یوم آزادی منایا گیا اور ایک عہد لیا گیا۔ یہ ایک اہم دن تھا، کیونکہ جب آزاد ہندوستان کے جمہوری آئین کا اعلان کیا جانا تھا تو اسی دن کا انتخاب کیا گیا۔

6 اپریل 1930 کو سول نافرمانی تحریک کا دوسرا دور شروع ہوا جس میں گاندھی جی نے اپنے مشہور ڈانڈی مارچ کے ساتھ حکومت کی نمک اجارہ داری کے خلاف نمک ستیہ گرہ کا آغاز کیا۔ اس کے نتیجے میں انگریزی سامانوں کا بائیکاٹ کیا گیا۔ شراب خانوں کا محاصرہ کیا گیا اور بڑے پیمانے پر ہڑتالیں

ہوئیں۔ ایک سال کے اندر تقریباً ساٹھ ہزار لوگوں کو جیل میں ڈالا گیا۔ کشمیر سے کنیا کماری اور گجرات سے بنگال تک متعدد افراد زخمی ہوئے اور سیکڑوں مارے گئے۔

دریں اثنا برطانوی حکومت نے لندن میں پہلی گول میز کانفرنس منعقد کی۔ کانگریس کے علاوہ اس میں سبھی کی نمائندگی تھی۔ اب وائسرائے نے کانگریس کے ساتھ مذاکرات شروع کیے۔ گاندھی اور اروِن کے درمیان معاہدہ ہوا جس کی اتباع میں تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کردیا گیا اور دوسری طرف کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک واپس لے لی۔ گاندھی کو 1931 میں کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے پر آمادہ کرلیا گیا۔ جب گاندھی دوسری گول میز کانفرنس سے خالی ہاتھ ہندوستان واپس لوٹے تو کانگریس نے سول نافرمانی کی اپنی تحریک دوبارہ شروع کردی۔ گاندھی کو گرفتار کرلیا گیا اور کانگریس کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔

جس وقت گاندھی اور دوسرے کانگریسی نمائندے جیل میں تھے، لندن میں تیسری گول میز کانفرنس منعقد ہوئی۔ انگریز حکومت نے فرقہ وارانہ نمائندگی کے اپنے منصوبے کو پسماندہ طبقوں تک بھی پھیلا دیا۔ گاندھی کو اس میں مسلمانوں اور پسماندہ طبقوں کو ایک متوازن طاقت کی طرح استعمال کرنے کی ایک سازش نظر آئی۔ گاندھی نے مرتے دم تک بھوک ہڑتال (آمرن انشن) کرنے کا اعلان کیا۔ انگریز حکومت کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس کے نتیجے میں پونہ معاہدہ عمل میں آیا۔ گاندھی کو رہا کردیا گیا۔ اسی دوران لندن میں تیسری گول میز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935 وجود میں آیا جس کے تحت ایک کل ہند وفاق اور صوبائی خودمختاری کی بنا پر نئی صوبائی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ کانگریس نے اس ایکٹ کو اندر سے توڑنے کے لیے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ گیارہ میں سے سات ریاستوں میں کانگریس کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ اس نے صوبائی حکومتیں قائم کیں اور مختلف ترقی پذیر اقدامات کیے۔ یو۔ پی۔ میں، جہاں پر کانگریس اور مسلم لیگ کا اتحاد قائم ہونے کے امکانات تھے، لیکن نہرو اس پر راضی نہیں ہوئے۔ اس کے بجائے انھوں نے کانگریس تنظیم کے لیے مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ایک عوامی رابطہ تحریک چلائی۔ اس سے مسلم لیگ کی کشیدگی میں مزید اضافہ ہوگیا۔

کانگریس حکومت کی کامیابی اتنی شاندار تھی کہ مسلم لیگ کی شناخت کو دوبارہ قائم کرنے کے لیے راستے تلاش کیے جانے لگے۔ حکمرانوں نے مسلمانوں کو کانگریس کے خلاف اکسانے میں مدد کی۔ کانگریس کے خلاف بے بنیاد الزامات پر بنی ایک رپورٹ ''پیر پور رپورٹ'' تیار کی گئی جو فساد کی جڑ بن گئی۔

دریں اثنا، یورپ میں حالات مزید پیچیدہ ہو گئے تھے۔ اس کے نتیجے میں سبھاش چندر بوس کی سربراہی میں ایک جنگجو گروہ تیار ہوا جو برطانیہ کی مشکلات کا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ حالانکہ انھیں کانگریس کو چھوڑ کر ایک فارورڈ بلاک قائم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ کانگریس نے ہندوستان کے باہر کی جمہوری طاقتوں کے ساتھ اتحاد قائم کرلیا یعنی نازیوں اور فسطائیوں کے خلاف۔ ہندوستان کے اندر اس نے شاہی ریاستوں میں قومی آزادی کی جدوجہد کو منظم کرنے کی طرف توجہ مبذول کی۔

جہاں تک ہندوستان سے باہر کے حالات کا تعلق ہے تو نہرو، سبھاش چندر بوس کے رویے کے قطعی طور پر مخالف تھے۔ جب کہ بوس، انگریزوں کی غلامی کے طوق کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے نازیوں اور فسطائیوں کی مدد لینے کو حق بجانب تسلیم کرتے تھے، وہیں دوسری طرف، نہرو ذاتی طور پر نازیت اور فسطائیت کے سخت مخالف تھے۔

حکومت کے ساتھ تعاون کی کانگریس کی رضامندی کے لیے نہرو پوری طرح سے ذمے دار تھے، لیکن ان کی شرط تھی کہ جن اصولوں کے لیے اتحادی فوجیں لڑ رہی ہیں ان کی توسیع ہندوستانی لوگوں تک بھی کی جائے اور مرکز میں ایک قومی حکومت کا قیام کیا جائے۔ برطانیہ نے کانگریس کا مطالبہ رد کردیا اور جنگ کے بعد اصلاحات کا ایک مبہم وعدہ کیا۔

تعاون کی اپنی پیشکش کے رد ہو جانے کے بعد کانگریس حکومت نے استعفیٰ دے دیا اور ایک نئی سول نافرمانی تحریک کا آغاز کیا۔ گاندھی کے چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے انگریزوں نے بڑی مشقت کے ساتھ جناح کو مسلمانوں کے گاندھی کی حیثیت سے تیار کیا۔

ہٹلر کی فوجوں نے یورپ کے بیشتر علاقوں کو روند ڈالا اور وہ تیزی کے ساتھ بحرِ روم کے ساحلوں کی طرف پیش قدمی کررہی تھیں۔ دوسری جانب، جاپانی فوجیں آگے بڑھیں اور انگریزوں کو جنوب مشرقی ایشیا سے باہر نکال دیا۔ ہندوستان پر جاپان کے حملے کا خطرہ تھا جس کے نتیجے میں کانگریس، مسلم لیگ اور اقلیتی گروہوں سے معاہدے کے لیے کرپس (Cripps) نے ہندوستان میں قدم رکھا۔ نئی دہلی میں مذاکرات شروع ہوئے۔ صدر روزویلٹ نے بھی اپنے سفیر فلپس (Philips) کو اس یقین دہانی کے لیے بھیجا تھا کہ کانگریس برطانیہ کے ساتھ تعاون کرے اور دونوں ایک معاہدے پر پہنچ

جائیں تاکہ جاپان کے خلاف محاذ کو مستحکم بنایا جا سکے۔لیکن بعض وجوہ سے کرپس کی کوششیں خاک میں مل گئیں۔

نازک مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستانی وزیر دفاع کیا رول ادا کر سکتا ہے۔ کانگریس جنگ کی کارروائی میں محوری طاقتوں کے خلاف فوری اور فعال رول چاہتی تھی۔ لندن میں برطانوی کابینہ اس مسئلے پر ہتھیار نہیں ڈال سکتی تھی۔ کرپس نے فوری طور پر محض ہندوستانیوں پر مشتمل ایک ایگزیکیٹو کونسل کا وعدہ کیا،لیکن جنگی کارروائی میں اس کی کوئی موثر آواز نہیں تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد خودمختاری کی یقین دہانیاں بھی مبہم تھیں۔اب کانگریس نے ایک قرار داد پاس کی جس میں برطانیہ سے ہندوستان کو چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے 8اگست 1942 کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ''بھارت چھوڑو'' کی مشہور قرارداد منظور ہوئی اور گاندھی کی قیادت میں پرامن عوامی جدوجہد شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

دوسرے دن، 9اگست 1942 کی صبح کو قومی رہنماؤں کو گرفتار کر کے نا معلوم جگہوں پر لے جایا گیا۔ گاندھی کو پونہ میں آغا خاں پیلس میں رکھا گیا، نہرو اور دوسرے رہنماؤں کو احمد نگر قلعہ اور دوسری جگہوں پر قید کیا گیا۔ گاندھی نے ہندوستانیوں کو ایک معنی خیز پیغام دیا تھا، انھوں نے کہا تھا کہ ہر ہندوستانی خود کو آزاد محسوس کرے۔ چھاپہ خانوں پر پابندی لگا دی گئی تھی، لیکن ہر شخص اپنے آپ میں ایک چلتا پھرتا اخبار بن گیا تھا۔ بعض جگہوں پر مشتعل ہجوم نے حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے مقرر کیے گئے افسران، یہاں تک کہ مجسٹریٹ پر بھی دھاوا بول دیا۔ اس تحریک کی ایک نمایاں خاصیت اس میں طلبہ کی حصے داری تھی۔ متعدد جگہوں پر ان کے اجتماع پر گولیاں برسائی گئیں۔ لا تعداد مظاہرے ہوئے۔ اسی طرح ہڑتالیں ہوئیں، دکانیں اور کاروبار بند کر دیے گئے اور فیکٹریوں میں مزدوروں نے ہڑتال کر دی۔ بعض جگہوں پر مظاہروں اور ہنگاموں نے تشدد کی شکل اختیار کر لی۔ پولیس اور فوج بلائی گئی۔ چرچل نے پارلیمنٹ کو اطلاع دی کہ برطانیہ کے ہندوستان سے تعلقات کے دوران اتنی بڑی تعداد میں برطانوی فوجیں کبھی ہندوستان نہیں آئیں۔ جبر و تشدد اس پیمانے پر تھا جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ 538 جگہوں پر فائرنگ ہوئی۔ حالانکہ سرکاری رپورٹ کے مطابق 1028 لوگ مارے گئے اور 3200 زخمی ہوئے، لیکن عام رائے کے مطابق 25,000 لوگ انگریزی گولیوں سے مارے گئے ۔متعدد جگہوں پر حکومت کو ذرائع ترسیل میں خلل اندازی اور پولیس تھانوں خزانوں اور ڈاک خانوں پر حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ بنگال کے مدنا پور، یو۔ پی۔ میں بلیا اور گجرات کے سورت میں متوازی حکومتیں قائم کر دی گئیں۔

جس وقت کانگریس ہندوستان کی آزادی کے لیے جدو جہد کر رہی تھی اس وقت اس کے مساوی ایک اور اہم پیش رفت ہو رہی تھی۔ نیتا جی سبھاش چندر بوس، جنھوں نے ایک مسلح ''ہندوستانی فوج'' کی جرمنی میں تشکیل کی تھی، ایک آب دوز کے ذریعے جنوب مشرقی ایشیا پہنچ گئے۔ یہاں پر جاپان کے ہاتھوں بنائے گئے ہندوستانی جنگی قیدیوں نے ان کے ساتھ مل کر ایک انڈین نیشنل آرمی قائم کی جس نے انڈمان پر قبضہ کر لیا۔ نیتا جی نے ہندوستانی جھنڈا لہرایا۔ ان کی فوجوں نے برما کے پار سے منی پور میں پلیل کے راستے ہندوستان میں بھی دھاوا بولا اور کوہیما کا محاصرہ کر لیا۔ انڈین نیشنل آرمی کی پیش قدمی کو اتحادی فوجوں نے روکا جو ہندوستان کے شمالی مشرقی کنارے پر جمع تھیں۔ بنگال پر انڈین نیشنل آرمی کے حملے کے امکان قوی نظر آ رہے تھے۔ انگریزوں نے مشرقی بنگال کی تمام کشتیوں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔اس خلل اندازی کے نتیجے میں شدید قحط سالی ہو گئی۔ تقریباً چالیس لاکھ لوگ فاقہ کشی سے مر گئے۔

1942 کی بغاوت کو گو کہ کچل دیا گیا لیکن اس کا پیغام انگریزوں کے لیے بالکل واضح تھا۔ جنگ میں جاپان کی شکست اور جنوب مشرقی ایشیا پر دوبارہ قبضے کے ساتھ ہی انڈین نیشنل آرمی کو بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے افسروں اور سپاہیوں پر مقدمہ چلائے جانے کے لیے انھیں دہلی کے لال قلعے میں لایا گیا۔ ان پر یہ جرم عائد کیا گیا کہ انھوں نے برطانوی تاج کی وفاداری کے حلف کی خلاف ورزی کی تھی اور وہ غدار ہیں۔ ہندوستانی عوام نے انھیں قومی ہیرو قرار دیا۔ پورے ملک میں اس مقدمے کے خلاف غم و غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ٹھیک اسی وقت، بمبئی میں رائل انڈین نیوی کے افسران نے بغاوت کر دی۔ برطانیہ کو دیوار پر لکھی عبارت صاف نظر آ رہی تھی۔ ہندوستان کو ہتھیار کے زور پر اب مزید نہیں دبایا جا سکتا تھا۔

1945 میں، برطانیہ میں ہندوستان کے لیے بھی خوش قسمتی سے ایک مزدور حکومت اقتدار میں آئی۔ اس کے کچھ ہی وقفے کے بعد، ہندوستان کے وائسرائے نے اعلان کیا کہ 1946 کے آغاز میں پورے ''برطانوی ہند'' میں انتخابات منعقد کیے جائیں گے۔ انتخابات ہوئے۔ کانگریس حکومت پنجاب اور بنگال کو چھوڑ کر سبھی صوبوں میں اقتدار میں آئی۔ فروری 1946 میں وزیر اعظم ایٹلی نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک نئے طریق کار کی ضرورت ہے۔ اگلے مہینے ایک کیبنٹ مشن ہندوستان پہنچا۔ اس مشن نے دو سطحی وفاق کا ایک منصوبہ پیش کیا۔ کانگریس اور لیگ دونوں نے

اس منصوبے کو قبول کر لیا۔ نہرو کو حکومت سازی کے لیے دعوت دی گئی۔ کانگریس کے منتخب صدر کی حیثیت سے انھوں نے بمبئی میں یہ اعلان کیا کہ دستور ساز اسمبلی خود مختار ہوگی۔ اس پر جناح رضامند نہیں ہوئے۔ انھوں نے ایک عارضی حکومت تشکیل دینے کی نہرو کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ جس وقت کانگریس عارضی حکومت تشکیل کرنے جا رہی تھی، جناح کی مسلم لیگ نے، انگریز شہریوں اور فوج کے ایما پر، 15اگست1946 کو ''براہ راست کارروائی'' کا اعلان کیا۔ اس کے نتیجے میں کلکتہ میں قتل وخون اور دہشت کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ اس کی بازگشت پنجاب، بہار، یو.پی. اور مشرقی بنگال میں بھی سنائی دی۔ فسادات کے تدارک کے لیے گاندھی جی ایک جگہ سے دوسری جگہ کا دورہ کر رہے تھے۔ فروری 1947 میں اٹلی نے برطانوی حکومت کے فیصلے کا اعلان کیا کہ جون 1948 میں برطانیہ ہندوستان چھوڑ دے گا۔ اگلے مہینے یعنی مارچ 1947 میں ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت سے آیا جسے دراصل اقتدار کی منتقلی کا منصوبہ تیار کرنا تھا۔

اقتدار کا منصوبہ بڑے پیمانے پر لارڈ ویول کی تجاویز پر مبنی تھی۔ یہ تھا دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے سبھی رہنماؤں سے مذاکرات کیے۔ جس وقت گاندھی جی فرقہ پرستی کی آگ بجھانے کے لیے نوا کھالی میں تھے، ماؤنٹ بیٹن نے نہرو اور پٹیل سے مذاکرات کر کے انھیں پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر رضامند کر لیا، دوسرے لفظوں میں دو قومی نظریے کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا وجود میں آنا۔ دونوں حکومتوں کے درمیان سرحدیں کھینچنے کے لیے ریڈ کلف کا تقرر کیا گیا۔ 15 اگست 1947 کو اس کا اعلان کر دیا گیا۔ اس وقت جذبات بھڑک اٹھے اور دونوں طرف کی سرحدوں پر بڑے پیمانے پر لوٹ، غارتگری اور قتل عام ہوا۔ سرحد نے پنجاب اور بنگال میں نہ صرف اضلاع بلکہ گاؤں اور گھروں کو بھی تقسیم کر دیا تھا۔ دنیا تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت دیکھ رہی تھی۔

بہر حال، ایشیا میں قومی آزادی کی تحریکات نے برطانیہ کی کمزوری کو بے نقاب کر دیا تھا۔ اب برطانیہ کے ہتھیار نا قابل تسخیر نہیں رہ گئے تھے۔ دراصل برطانیہ کی ناموری ایک نئے زوال کو پہنچ گئی تھی۔ برما اور سنگاپور میں جو واقعات پیش آئے، اور اس کے عمدہ جہازوں کے ڈوبنے کے بعد، برطانیہ اپنی طاقت کا مزید مظاہرہ کرنے کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ عقل مندی اسی میں تھی کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ حالانکہ، قبل اس کے کہ وہ ہندوستان کو چھوڑے اس نے اسے تقسیم کر دیا، جیسا کہ اس نے آئرلینڈ اور فلسطین وغیرہ کے معاملے میں کیا تھا۔ لیکن ہندوستان کی بات دوسروں سے مختلف تھی۔ یہ تاج برطانیہ کا لعل تھا۔ ہندوستان سے برطانوی حکومت کا خاتمہ، ایشیا پر مغربی تسلط کے خاتمے کی علامت تھی۔ یہ دنیا کی تاریخ میں بھی ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔

□□□

احمقوں کی جنت

مصنف: شنکر/ مترجم: ڈاکٹر شریف احمد

''احمقوں کی جنت'' میں بچوں کے لیے 12 چھوٹی چھوٹی مزیدار اور سبق آموز کہانیاں ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے بچے اپنی ہنسی روک نہیں سکتے۔
ہر کہانی کے ساتھ کارٹونی تصویر بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 24، قیمت: -/12 روپئے

ربن

مصنف: سوکمار شنکر/ مترجم: کے. پی. رائے زادہ

بچوں کو اپنے کھلونے، میک اپ اور کھیل کود سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے اور وہ ان موضوعات پر خوب مزے لے لے کر باتیں کرتے ہیں۔ انھی سامان تفریح میں ایک ''ربن'' ہے جو مالا کی سالگرہ پر اس کی ماں دیتی ہے۔ یہ ''ربن'' کس کس طریقے سے اس تک پہنچتی ہے کہانی میں اس کا پر تجسس بیان بچوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

صفحات: 16، قیمت -/15 روپئے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

क़ौमी काउन्सिल बराए-फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
NATIONAL COUNCIL FOR PROMOTION OF URDU LANGUAGE
Ministry of Human Resource Development, (Deptt. of Secondary and Higher Education), Govt. of India
West Block - 8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi-110 066.
Tel.: 011-26169416, 26109746 Fax: 011-26108159 E-mail: urducourse@rediffmail.com

اردو زبان میں ڈپلوما کورس

فاصلاتی نظامِ تعلیم کے تحت اردو زبان میں ایک سالہ ڈپلوما کورس (07 - 2006)
بذریعہ انگریزی اور ہندی یکم اپریل 2006 سے شروع کیا جارہا ہے۔

رجسٹریشن 28، فروری 2006 تک

کورس کا خاکہ:

(1) انگریزی یا ہندی کے ذریعے اردو رسم خط سکھانا
(2) قواعد اور Comprehension کا مختصر تعارف
(3) اردو نثر و نظم کا مختصر تعارف۔

یہ کورس دو طریقے سے چلایا جارہا ہے، اوّل اردو اسٹڈی سینٹروں کے ذریعے اور دوم براہِ راست قومی اردو کونسل کے ذریعے۔

کنٹیکٹ کلاسیں: سیکھنے والوں کی آسانی کے لیے اسٹڈی سینٹر میں کنٹیکٹ کلاسیں منعقد کی جاتی ہیں۔

اہلیت: انگریزی اور ہندی جاننے والے افراد اس کورس میں داخلے کے اہل ہیں۔ عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔

فیس: اردو اسٹڈی سینٹر کے ذریعہ ڈپلوما کورس میں داخلے کے خواہش مند افراد کو کورس کی مکمل فیس -/200 روپے (بشمول دستور العمل (prospectus) اور داخلہ فارم) متعلقہ سینٹر میں رجسٹریشن کے وقت جمع کرنی ہوگی۔ کورس کا مواد مفت فراہم کیا جائے گا۔

جو طلبہ قومی اردو کونسل کے ذریعہ براہِ راست اردو ڈپلوما کورس کرنا چاہتے ہیں وہ -/350 روپے کا ڈیمانڈ ڈرافٹ، این۔سی۔پی۔یو۔ایل، نئی دہلی کے نام سے بھیج کر براہِ راست رجسٹریشن کراسکتے ہیں۔

دستور العمل (prospectus) اور داخلہ فارم کے لیے متعلقہ ریاست کے مراکز یا قومی اردو کونسل سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

کونسل کے اردو اسٹڈی سینٹروں کے نام و پتے:

<u>ANDHRA PRADESH</u> ☛ **NCPUL, South Region Branch Office:** M.C.H No. 22-7-110 to 141,3rd Floor, Maxi Block, S.Y.J. Complex, Patthargatti, Hyderabad-500002. Ph: 24415194 ☛ **Society for Arabic Academy:** 10-3-280, Flat No. 505, Osman Plaza, Humayun Nagar, Hyderabad - 500028 ☛ **Little Nightingales School:** Chowne Nader Alibeth, Chanchalguda,Hyderabad, Ph: 55300630 ☛ **Al-Suffa Model High School:** Tadban, Hyderabad. ☛ **Magnific High School:** Indra Nagar, Phisalbanda, Behind

Santosh Nagar Police Station, Hyderabad- 59 Ph. : 24532500, 55304608 ☛**Hanafia Arabic Institute:** H.No. 17 - 4 - 300 Mata Ki Khidki, Outside Dabirpura, Hyderabad - 23 ☛**Samdani Educational Society:** D.No. 19-1-436 / A / 89, Osmanbagh, Near Kamatipura Police Station, Bahadurpura Hyderabad. ☛**Al-Falah Education & Welfare Society:** Urdu Ghar Adoni, H.No. 2-288, Bharpet Shairkhan House Adoni-518301 Distt. Kurnool Ph: 252425 ☛**Al-Quba Educational Technical & Welfare Society:** H. No. 29-1-183, (3-3-4/2), Behind Bharat Talkies, Mahaboob Nagar, Ph : 9396312848 ☛**Arrahman Educational Society:** Door No. 9/239, Lal Masjid Road, Kurnool-518001 Ph : 223314 Cell : 9440005448. ☛**Sidra Women's Welfare Society:** 10-3-15, Mujaddidy Estate, Mehdipatnam X-Road Hyderabad- 500028 Ph: 24463426 ☛**Faiz Ahmed Faiz Memorial International Institute:** Aiwan-e-Pairaki (693 Special Class) New Mallapally, Hyderabad-500001 Ph: 3346682 ☛**Mallapally Welfare Society:** Public Library Mallapally, Nizamabad-503001 Ph: 222180, (O) 251325 ☛**Khaja Mahila Mandali:** H.No. 3-13, Dargah Hussanin, Shahvali, Lingampally Mandal, Distt. Ranga Reddy Ph: 9346340917 ☛ **Iwan-e-Qawateen Educational Society for Women:** 2-1-908/2 Muradnagar Hyderabad-500028 Mobile.: 9866851252: **BIHAR:-** ☛**Imarat-e-Sharia Educational & Welfare Trust:** Phulwari Sharif, Patna-801505 Ph: 2255581, 2257012 ☛**Millat Educational Society:** Station Road, Samastipur - 848101 Ph: 226415 ☛**Kainat International School:** Kainat Nagar, Kako (Jehanabad) Bihar-804418 Mobile 9431297223 Ph: 255314 ☛**Kainat Foundation, Kainat International School:** P.G. Road (Fida Hussain Road) Jehanabad - 804408 Ph: 227781 ☛**Rehmani Computer Centre, Rehmani Foundation:** Nawab Kothi, Belan Bazar Munger - 811201 Ph: 224477 Fax : 224488 ☛**All India Rajiv Social Welfare Mandal Society:** Family Counselling Centre, North Ring Bandh, Backside of Kiran Cinema, Sitamarhi, Mobile:, 9899858095 ☛**Shatabdi Public School:** Katari Hill Road, Gaya-823001 Ph.: 2424301 ☛**Anjuman Taraqqui-e-Urdu Sub Division Mahnar:** At. Mahnar, Vaishali, Bihar ☛**Anjuman Taraqqui-e-Urdu:** Distt. Sitamarhi, Mehsaul Chowk, Dumra Road Sitamarhi-843302 Ph.: 254301 ☛**Anjuman Taraqqui-e-Urdu:** Bihar Urdu Bhawan, IInd Floor, Ashok Rajpath, Patna-800004 Ph.:2300656 Mobile.: 9431076798 ☛**Anjuman Taraqqui-e-Urdu:** Barachakiya, E.Champaran Bihar (Pin-845412) Ph.: 244274, 244442 ☛**Madarsa Faizul Uloom:** Vill. Chand Chaur Rahim Tola, P.O. Bela Megh Distt. Samastipur Bihar ☛**Nalanda Samaj Seva Ashram:** Mohalla Chhajju, Naseerpur P.O. Bihar Sharif Distt. Nalanda-803101 ☛**Maulana Abul Kalam Azad Urdu Library:** Jalkaura, Khagarya-851222 Ph.: 230008, 23002; **DELHI:-** ☛**Anjuman Taraqqi Urdu Hind:** Urdu Ghar Marg, 212, Rouse Avenue, NewDelhi Ph:23237210 M: 9811716909 Fax: 23239547 ☛**Madarsa Talimul Quran:** Haji Langa, Sector - 3 R.K. Puram, New Delhi Ph: 26178298 ☛**Madarsa Zeenatul Quraan:** B - 291, Welcome, Seelampur, Shahdara, Delhi - 53 Ph: 22828596 - 22825578 ☛**National Arabic School:** C-278 / 5, Shaheen Bagh, Abul Fazal Enclave Phase - II, Jamia Nagar Okhla, New Delhi - 25 Ph: Off: 55394007 M: 9811693308 ☛**L.S.P.S. Education Society:** P - 5 / 40, 41 (Near Masjid) Mangol Puri, Delhi - 110083 Ph: 27914174 M: 20568156 ☛**Rohtash Memorial Education, Jogendra Public School:** Main Sherpur Chowk, Karawal Nagar Road, Delhi - 110094 Ph: 22191074 ☛**The Hermein Education Society (Regd.):** 118, Pratap Khund, Vishwa Karma Nagar, (Jhilmil) Delhi - 110095 Ph: 23280772, 23266102 ☛**Rural Association for Women's Alligatory Tribute (RAWAT):** B - 6 / 21, P & T Colony, Janak Puri, New Delhi - 110058 Ph: 25590670 M: 32012055 ☛**Jamia-Tus-Suffa:** N-81, Sailling Club Road, Lane No. 2, Batla House, Jamia Nagar, New Delhi - 110025 M: 9891104786, 9312607211 ☛**Society for Social Development (S.S.D.):** E-18, Pipal Wala Road, Mohan Garden, Uttam Nagar, New Delhi-59 ☛**Subham Educational & Cultural Society:** Khasra No. 5/1 & 11/2, Tomar Colony, 30 ft Road, Kamal Pur Majra, Burari, Delhi-84 Ph: 20096834 ☛**Rashtriya Mahila Sanjivani:** 2085, Ganjmir Khan, Turkman Gate, New Delhi-2 Ph.: 23280912, 23255366 Mobile: 9312269070 ☛**M.E.T. Public School:** Jam-e-Masjid, Sector - 8, NOIDA, U.P. Phone : 2424238, 32005437; **GUJRAT:-** ☛**Majlis-e-Dawatul Haq - Surat, Co-Ordinator Study Center- Surat Maulana Azad National Urdu University:** Moh. - Sadat Nagar At & P.O. - Unn Distt. - Surat Pin-394210 Ph: 2750372, 2751660 ☛**Anjuman Falahe Daren:** At. Ratanpur (Dantal) Ta. Danta, Distt. - BK (Banaskantha) (N. Guj) Pin - 385120 Ph: (O): 278243 (R): 278258 M: 9426365249 ☛**Shams School:** Near Industrial Post Office, Rakhial, Ahmedabad-380023, Gujarat Ph: 2749955, 2746096. ☛**Darul Uloom Hansot Jamiah

Mazhar-e-Saadat: At & P.O. Hansot-393030 Distt. Bharuch Ph: 262031 Telefax: 262050. **Aman High School Ichchhaba Society:** Near Rehmaniya Masjid, Limbayat, Udhna Yard, Surat-394210 Telefax: 2282004 **Madarsa Mohamadiyah Arabiyah Islamia:** Vehwanya Memon Road, Near Sodhawadi P.B. No. 53, Jamnagar-361001Telefax: 558105 **Ilahi Education Trust Madresa-e-Faruke Azam:** Limwali Masjid, Pani Gate, Vadodara Ph: 3946734 M: 9427351071 **Aman High School (Saiyed Dana Education Trust's) Ichchhaba Society:** Near Rehmaniya Masjid, Limbayat, Udhna Yard, Surat-394210 Ph.: 2282004 **Farooq-e-Aazam (R.A.) Girls High School Salamat Society** : C/o Mubarak Masjid Opp. Agro Petrol Pump, Sarkhoj Road, Ahmedabad-55 **Rehbar Mahila Mandal:** Balasinor Old Palace, AT. Balasinor-388255 Distt. Khera Ph.: 267197; HARYANA:- **muhammadiya Public School:** Bara, Rithat Distt. - Mewat, Haryana M: 9416164102 (P.P.) **Computerised Calligraphy Training Centre:** Yasin Meo Degree College, Nuh-122107 Distt. Mewat (Haryana); **Al-Rasheed Ideal High School:** Chhachhrouli Road, Jagadhri-135003 (Haryana). JAMMU & KASHMIR:- **National Ibrahim Memorial Welfare Society:** Qasim Nagar, Mendhar Distt.- Poonch 185211 Jammu & Kashmir **Hi Fi Computer Technology Institute:** Kashmir Sarhadi Tarkyatee, Adara Pattan, College Road, Kupwara, Regipora, Distt.- Kupwara-193222 J & K **Madarsa Jamia Islamia Noor-ul-Huda** : V.P.O. Chhungan, Teh. Mendher, Distt.- Poonch Pin: 185211 J & K **New Kashmir Educational And Cultural Society (NGO):** H.O.: 114, Nursing Garh, Balgarden Srinagar-190010 Ph: 2472619 **Islami Model School:** Gujjar Nagar, Jammu Ph: 2576438 **Kashmir Research Institute of Educational and Solar Technology, (KRIEST Society):** General Bus Stand, Post Box No. 68 H.P.O. Anantnag-192101; JHARKHAND:- **Mahila Dastkari Vidyalaya:** Shamimabad, P.O. - Itki, Distt.- Ranchi-835301, Jharkhand Ph: 227216 Mobile: 9431169879 **Bright Career Coaching Institute:** S.R. Market, Bus Stand Chitarpur Ramgarh Cant.,Distt.-Hazaribagh Pin: 825101 Ph: 251740, 251789 Mobile: 9431153707, 9431153777 **Darul Uloom Wahidia:** Mahora, Jamtara, Pin: 815351 Ph: 258066 Cell: 9396312848; KARNATAKA:- **Jamia Noor-Ul-Islam:** Mohalla Chawthai, Chitguppa Distt- Bidar K.S. - 585412 **Hyderabad Karnataka Child Labour Development Programme:** MIG 2nd KHB Colony, Basavakalyan-585327 Distt.-Bidar, M: 9448422650 Fax: 2650774 **Mysore Educational Social & Cultural Organisation (MESCO):** MESCO, I.T.I. Building Link Road, N.R. Mohalla Mysore - 570007. Ph: Off: 2491799 Resi : 2491585 **Reshmi Welfare & Educational Society (Regd):** Al Meelad Urdu High School Keshwapur, Hubli - 23, Ph: 2354861 **Khairul Basher, Foukhaniya Arabic School, (Marhaba Arabic Education Society):** Rangampet - 585220 Tq. Shorapur, Distt. - Gulbarga **Haleema Educational & Charitable Trust:** S.F.S. 13, MIG, 2nd, K.H.B. Colony, Vakkalgera, Near Bilalabad, Gulbarga-585104 Ph: 2425299 **Huda Educational Minority Society (R):** Cowl Bazaar Bellary-583102 Ph: off. 243203 Resi. 240980 **Karnataka Urdu Academy:** Kannada Bhawan J.C. Road Bengalore-560001 Ph: 2213167 **Al Meraj Minority Education Society:** Bhadkal Base, Dubal Gundi Pin-585418 Tq. Humnabad, Distt. Bidar, Ph.: 273668 **Tipu Shama Education Society:** H. No. 5-232/1, Near Noor Bagh Roza 'B', Bulgarga-585104 Ph: 27755 Mob: 9880672164; KERALA:- **Jamia Sa-Adiya Arabia, (NCPUL Study Centre):** Sa-Adabad, Deli, P.O. - Kalanad, Kasaragod-671317 Ph: 2437216, 2438216, 2437841 Fax: 2236776 **Madeenathunnoor College:** Markaz Garden, Poonoor Unnikulam, Kozhikode-673574 **Markazu Saquafathi Ssunniyya (Sunni Cultural Centre):** Karanthur, Kozhikode-673571 Ph: 2800121, 2800421, 2800427 Fax: 2801831 E-mail: sunnimarkaz@hotmail.com **Sirajul Huda Educational Complex:** P.B.No. 04, P.O. Kuttiadi-673508 Kozhikode Ph: 2596496, 2596497, 2597098 E-mail: sheckuttiadi@sancharnet.in. sirajulhuda@hotmail.com **Jamia Hasaniyya Islamiyya:** Hasaniyya Nagar (Kallekkad), Palakkad-678004 Ph: 2856643, Telefax: 2857256 **Ubaibas Foundation:** 1&2 M.M. Abdul Huq Street, Truipattur-635602 Ph: 220366; MADHYA PRADESH:- **Kranti Kala Sangam,** H.No. 1 Near Kilole Park, Opp. Petrol Pump, 4 Bunglow Road, Bhopal (M.P.), Phone : 07532 - 230420, Mobile - 09827364784; **Moulana Barkatullah Bhopali Educational & Social Service Society,** 12, Moti Market, Sultania Road, Bhopal-462001 (M.P.), Phone : (Off.) 2642715, (Resi) 2545901; **Madarsa Darul Ifta Wal Irshad,** 29 / 162,Behind National School, Ghosipura, Guna, M.P. (Pin - 473001), Phone : 07542 - 250716; **Madhya Pradesh Qaumi Khidmatgar Society,** Qutub Bhawan, Opp. Nehru Park, Kant Road, Guna, M.P., Phone : 07542 - (Off.) 500893, (Resi.) 507801, Mobile : Mobile : 9425131196; **Adarsh Samaj Seva Shiksha Samitee,** Mall Road, Morar, Gwalior,

(M.P.) Pin.- 474006, Tel.No. 0751-2366525, 5030024; **Shikshodaya M. School Neemuch**, 13/68, Moolchand Marg, Neemuch - 458441 (M.P.); ***Darul Uloom Mujahid-e-Millat*, Sarkare Kalan Urdu Education Society**, Ashraf Nagar, Dhanpuri, Distt. - Shehdol, M.P.; **Madhya Pradesh Qaumi Khidmatgar Society**, Haji Manzil, Babu Quarter Road, Kamlagunj, Shivpuri-473551, M.P., Mobile : 982722567; MAHARASHTRA:- **National Anglo Urdu High School**: Pimpri - 411018, Pune, Ph: 27424930, 27454186 M: 9422302292 **Allama Mohd. Taher Educational & Career (AMTEC)**: Foundation Beed Kagzi Darwaza, Near Darga Haz. Syed Suleman Beed 431122, Maharashtra M: 310114,9822457806 **Anjuman-i-Islam's Akbar Peerbhoy College of Commerce & Economics**: Maulana Shaukatali Road Two Tanks, Mumbai - 8 Maharashtra Ph: Off. 23074122 Principal: 23083405 Telefax: 23063587 **Magaswargea Gramin Mahila Bahu-Uddeshia Shikshan wa Samagik Kalyan Mandal**: Patur, Distt. - Akola, Maharashtra Ph: 243586 **Iqra Education and Social Welfare Society**: Branch - Patur Distt. - Akola, Maharashtra Ph: 243586 **Youth Education & Welfare Society, Nasik YEWS National High School**, Maulana Azad Road, Sarda Circle, Nasik-422001, Maharashtra Ph: 2594973 **Pragati Shikshan Sanstha**: Dariyapur, Distt. Amrawati, Maharashtra **Pahur Tanzeem-ul-Muslimeen**, Bada Mohalla, Pahur Tal.- Jamner, Distt. Jalgaon, Maharashtra-424205, Ph:242523 **Citizen Welfare Education Society**: 782, Khushamadpura, Malegaon-423203 Distt.- Nasik **Alqama Educational & Welfare Society**: Municipal Shopping Centre, Shop No. 5 Opp. New Bus Stand, Malegaon, Nasik-423203 Ph: 2434585, 2433624, 2439918 Telefax:2430470 **Osmania Mahila Shikshan Prasaraq Sanstha**: "Nasheman" Near Dr. Mehmood's Building, Khadka Road, Bhusawal-425201 **Gaaz Institute**: 2/A, Kaka Manzil, Co-op. HSG. Soc. Ground Floor, Kausa Mumbra, Distt.- Thane-400612 Ph: 25492205 **Khairul Bashar Education & Welfare Society**: Pahur Tal, Jamner Distt.- Jalgaon Ph: 242523 **Iqra Education Society's (H.J. Thim College of Arts & Science)**: Mehrun, Jalgaon-425135 Ph: 2211725, 2212735 Mobile: 9890041299; NORTH-EAST:- **North-East India Emarat-e-Shariah & Nadwatut Tameer**: P.O.-Badarpur - 788806, Distt. - Karimganj, Assam Ph: 269066. **Dawarus Sunnah - Zamia Madrassa**: P.O - Dasgram, Distt.- Karimganj, Assam **Dudpur Rural Development Club**: Vill Dudpur, P.O Baliura, Distt. Hailakandi, Assam **Assam Falah Society**: Howli, Barpeta, Assam-781003. Ph: 289323 (O); 289454 (R) 9435025377 **Institute of Oriental Studies Sijubari**, Dargah Road, H. No.153, (Opp. to Global Hospital) P.O. Hatigaon Chariali Guwahati-781038 Assam. Ph: 2224867, 2383050 Mob: 9435016395 **Hundred Flowers Higher Secondary School (CBSE)**: Pangee Road, Imphal East, Manipur P.O. Pangei, Pin: 795114 Ph: 2229294 **Human Resource Rural Development Association (HRRDA)**: Sekmaijin Queen Field, P.O. Mayang B.P.O. Sekmaijin Pin: 795132 Distt.- Thoubal Manipur **Mahila & Child Welfare Association**: Uchiwa Wangbal P.O. Mayang Imphal Distt.- Imphal, Manipur; ORISSA:- **Madani Welfare Association**: Plot No. 2631, 3rd Floor, Badagada Canal Colony, Sarugadia, B.J.B. Nagar, Bhubaneswar-751014 Orissa Ph:Off. 2502882, Resi. 2311686 Mob: 9437001686 **Rajya Akhyam Seba Sangha**: Room No. 6, Municipality Block Unit-4 Market, Bhubaneswar-751001 Ph: 2502589, 2471463; PUNJAB:- **Century Public School**: 36, Gali, Pelia Gate, Malerkotla - 148023, Distt. - Sangrur, Punjab Ph: 9417057792, 9855133686, 9872921999, 9814778607, 9814511154; TAMIL NADU:- **S. K's Educational Academy**: 36 Jani Jehan Khan Road, (Opp. Road to Zam Bazaar Police Station) Royapettah, Chennai-14 Ph: 28481344, 28483231, 28483281 Fax: 28440763 **Dr. Ahmed Ali Parpia Memorial Matriculation Hr. Sec. School (A Unit of Muslim Educational Foundation)**: No. 2 Pachaiappan Street Mount Road, Chennai-600002 Ph: 28548053; UTTAR PRADESH:- **Al-Ameen Institute of Information Technology**: Dr. Khan's Clinic, IInd Floor Main Bulandshahar Road, Hapur Ph: 2308027, 3091307 **M.E.T. Public School**, Jam-e-Masjid, Sector - 8 NOIDA, Ph: 2424238, 32005437 **Darul Uloom Makhdumiyan Arabia**: Vill. & P.O. - Wasa Dargah Distt. - Siddharthnagar Ph: 254795 **New Madarsa Aashiqul Quraan**: 509, Mazhar Manzil Kotla Street, Meerut, Ph: 2422476 Mob: 9897497340, 9897637009 **Madarsa Islamia Arabia Wasiatul Uloom**: Masjid Dhal Wali, Bakshi Bazar Allahabad Ph: 2656183 **Indian Educational Society**: Sadar Bazar, Distt. - Pratapgarh **Rahbar Charitable & Welfare Society**: M.I.G. - 2, L.D.A. Colony, Aishbagh, Lucknow Ph: 2263205, 3240695 Mob: 9415465189, 9415576755, 9335240695 **Shri Vardhman Inter College**: B Block Amrapali Market, Indira Nagar,Lucknow Ph: 2341570 **Sadbhavna**

Samanvay Sansthan: 3/200 Vikas khand, Gomti Nagar, Lucknow Ph: 2300188, 9415001956 ☛**Computer Point (Dar-e-Arafat):** Town Hall Market, Raebareli Ph: 2213446 ☛**Sanskriti Institute of Information Technology:** Anil Sewa Sansthan, 546 Satya Nagar, Raibareli Ph: 2200676 M: 3103091 ☛**Darul Uloom Rahimiah:** Raghauli, Ghosi, Distt. - Mau Ph: 229264 ☛**Madarsa Subhania:** 95, Maulana Kafi Road, Gadhi Sarai, Allahabad Ph: 2650336 ☛**Bhartiya Kisan Sanstha:** Mohalla Rahu Pura, Tanda,Distt Rampur M 9412477867☛**Sir Syed Public School:** Kabir Kunj Behind Prabhu Talkies, Roadway's Colony Loha Mandi, Agra Ph: 2111842 ☛**Jamia -Tul-Imam-e-Asar-wa-Zamman:** Sirsi Sadat Distt.- Moradabad. Ph: 23620 ☛**Jamea-Tut-Taiyebat:** 89/345 A (I), Daler Purwa Kanpur Ph: 2315763 Mob: 3813701 ☛**Islamic Scientific Academy:** Town / Post - Umri Kalan, Distt. - Muradabad Ph: 278214 ☛**Muslim Education Society:** Shahbad Road, Bellary, Distt. -Moradabad ☛**Fatima Education Society, Fatima Children Care Mission & Girls Junior High School:** Kambal Ka Tazia, Moradabad. ☛**Jamiatul Huda Al Islamia (Huda Islamic Institute):** Syed Ahmed Shaheed Nagar (Otiya) Post - Fatehpur, Distt. - Raibareli ☛**Rabita Sewa Sansthan:** Peer **Batawan (Phulwari),** Barabanki Ph: 22941, 27303 ☛**Milli Darsgah Aligarh Convent School:** 4/22, Chowk Farrukhabad Ph: 22449 ☛**Riya Jankalyan Samiti**, Qasdi Tola, Mughalpura -1st, Moradabad-6 M: 9837490050 ☛**Muslim Kindar Garden School:** Shakhayya Pura Behraich Ph: 23447 ☛**Jamiatul Shabab ul Islam:** Baraulia Tagore Marg, Lucknow Telefax: 327706 Mob: 09335256172 ☛**Jaliliya Muslim Girls Higher Secondary School:** Iradat Nagar, Dali Ganj, Lucknow ☛**Acadmey of Mass Communication:** 21 Bilhra House, R.K. Tandon Road, Near Kotwali Qaiser Bagh, Lucknow Ph: 2200310 ☛**Kainat Public School:** Moh. Imli Jhoolay Wali, Degree College Road, Near Transformer, Rampur Ph: 2329782 ☛**Jawahar Lal Sewa Sadan Samiti:** Mohalla Bajariya, Kadhu, Islam Ganj, Rampur Ph: 224538 ☛**Azad Alp Sankhyak** Utthan **Samiti:** Mohalla: Fateh Ullah, Ganj Thakur Dwara Distt.- Moradabad Ph: 244317 ☛**Ideal Educational Society Saadatganj:** Barabanki Ph: 258566 Mob: 9415141120 ☛ **H.A.W. Memorial English** School: Dhaunra Tanda, Bareilly ☛**Excellent Educational & Social Society:** Near Azad Welding Works, Raje Babu Road, BulandshaharPh: 227570 ☛**Madrasa Nooriya Khairiya:** Baghi Bhari, Post Peepiganj, Distt Gorakhpur Ph: 2762340 ☛**International Welfare Trust Urdu Shiksha Kendra:** 52, Mohalla Bangla, Sitapur Mob: 9810622431 ☛**Qasmi Educational Society:** 68, Dar-e-Jadid, Darul Uloom Deoband, Saharanpur ☛**Madarsa Ahle Sunnat Ziyaul Uloom:** Mohalla - Baghaicha Iltifat Ganj, Distt - Ambedkar Nagar Ph 284527 ☛**Chand Welfare Society:** Purana Gunj, Betuk Road, Rampur Ph: 2326040 ☛**Royal Technical Training Institute:** C/o India Radios, Idgah Market, G.T.Road, Etah Ph:236094 ☛**Rohilkhand Gram** Vikas **Utthan Samiti:** 773 Shahabad, Bareill, Ph: 2541125 ☛**Gramin Samaj Kalyan Audoyogiki Prashikshan Sansthan:** Nai Abadi, Holi Gate, Etah Ph: 231522, 236094 ☛**Faiz-e-Aam Muslim Hr. Sec.** School: Sheikhpur Jafar, P.O,- Raunahi, Distt.- Faizabad Ph: 255314 Mob: 09415139626 ☛**Regional Public** School: Laulai, LucknowPh: 2815192 ☛**Suhel Memorial English School:** H.No. 160, Kanghitola, Tehsil, Distt.- Bareilly Jodonpur, Bareilly Ph: 2457738 ☛**Mohammadiya Educational Society:** 273, Shah Qamar, New City, Etawa ☛**Ghani Talimi Markaz:** 64/12, Masjid Lal Kuwan, Lucknow Ph: 2236191 Mob: 9415012415 ☛**Shaheed Ashfaq Ullah Khan Infotech Centre:** Green Valley Jr. High School, Ahmadpur Chungi, Shahjahanpur Ph: 236047, 311625 ☛**Jamia Misbahul Uloom:** Chaukonia Bharat Bhari, Siddharthnagar Ph: 00961-5541-254602, 254620 Fax: 254802 ☛**Maulana Abul Kalam** Azad **Islamic Educational Academy:** Ratan Pura, Mirapur, (Suwar) Rampur Ph: 9719128961 ☛**Sandila** Girls **Intermediate College (Chaudhary Wajahat Ali Memorial Urdu Centre):** Sandila Hardoi Ph: 270978 Mob 9415016479 ☛**Allama Iqbal Educational Society (AIES):** 13/790, Scekhan Achnera-283101 Agra Ph 220758 ☛**Islamic Society Alflah Niswan College:** Mohalla Takia, Ahraura, Distt. Mirzapur-231301 Ph 0091-05443-224484 Mob: 9839562158 ☛**Bijnor Muslim Fund:** Qazipara Street, Bijnor Ph: 262767 Mob 9837469978 ☛**F.A. Ahmed School:** 258, Om Purwa, Kanpur-7 Ph: 2366877 ☛**Sir Syed Educational Samiti:** Tehsil+P.O. Bilgram Distt. Hardoi Ph: 241143 ☛**Nisar Higher Secondary Education:** Hansapura, Imli Bagh, Kopaganj, Mau ☛**GCT Educational Society:** D-20/271, Kisrol Street, Near Moulsiri Mosque, Muradabad Cell: 9897060895, 9837452878 ☛**Makhdoom Ashraf Educational & Social Welfare** Society: Vill: Baskhan Sharif, Distt. Ambedkar Nagar Ph: (O) 276272, 276111 Fax: 276069 Mob: 09415089643 ☛**Sanjeevani Social Welfare Society:** Plot No. 19, Cotton Mill Colony, Varanasi Mob: 9415228020

➡**Sandila Girls Intermediate College:** Sandila Hardoi Ph: 270978 Mob: 9415016479 ➡**J.S. Educational Centre:** E/E-47, Veerangana Nagar, Kanpur Road Jhansi Mob: 9415067674 ➡**Quresh Ideal Shiksha, Samiti:** Pathar Wali Masjid, Manoharpura, Bajariya Mathura Fax: 2408124 ➡**Abul Kalam Azad Educational Institute:** Azad Nagar, Domariaganj Distt. Siddharthnagar Ph: 244222 ➡**Madarsa Ayyubia Tajvidul Quran:** H.No. 131/314, Begum Purwa, Kanpur ➡**National Feminal Awake (Qaumi Niswan Markaz):** 107/35/10, Malka Gati Phatak, Baisi Ki Masjid, Lucknow Ph: 272108 ➡ **Abul Kalam Azad Girls Inter College:** Lakhimpur Kheri ➡**Women Organisation for Rural Development (WORD Sansthan):** C-211A, Ilahi Bagh Chowk Gorakhpur Ph: 2291258 ➡**Women Institute of Self Employment Training (WISET) (Bushra Education & Social Welfare Society):** Moh. Thotar Mansoori Street Behind Chowki Razzar, Rampur Ph: 2324498 ➡**Kushwah Public Junior High School:** Nagla Prithvi Nath, Shahganj, Agra ➡**Jameatus-Swalehat-Al-Islamia:** Mahmoodabad, Bisauna Road, Kareli Allahabad Ph: 0532-3091207 Mob: 9839468070; UTTARANCHAL:- ➡**Faizan Educational Welfare Society:** Hasnawala, Biharigarh, Haridwar, Uttranchal Ph: 2784555, 2784430 Mobile: 9891071484 (Delhi). ➡**Lingua Franca School of Languages:** Above Lohani Aata Chakki, Malli Bomori Haldwani, Nainital-263139 Ph: 282936 Mob: 9412037367 ➡**All India Ali Welfare Educational Society:** Azad Nagar, Kelakhera (Udham Singh Nagar), Uttaranchal Pin: 263152 Ph: 241182, 241431➡**Sandal Educational Welfare Academy (Under Spring Field Public School Society):** Khwaja Compound, Qidwai Nagar, Haldwani (Nainital) Mobile: 9359412620; WEST BENGAL:- ➡**west Bengal Urdu Academy, Minorities Development & Welfare Department:** Govt. of West Bengal, 75 / 2A, Rafi Ahmed Kidwai Road, Kolkata - 700016 (W.B.) Ph: 2448450 ➡**Teacher's Forum:** 22/2 Dharmadas Kundu Lane Shibpur, Howrah-711102 C/o West Bengal Urdu Academy Ph: 26426388 M: 9831516136 ➡**Subhas Chandra Bose Centenary College:** Lalbagh, P.O. & Distt. Murshidabad-742149 C/o West Bengal Urdu Academy ➡**Nutan Masjid Committee:** Nutan Masjid Complex, West of Lal Dighi, Roopnarayan Road, Cooch Behar-736101 C/o West Bengal Urdu Academy ➡**The Adabi Society High Madarsah:** P.O. Angus Distt.- Hooghly-712221 C/o West Bengal Urdu Academy ➡**M/s Subhashini Global Net:** Noor Mansion, 2nd Floor Rathbari, Station Road Pranta Pally, P.O. & Distt.- Malda-732101 C/o West Bengal Urdu Academy ➡**Hasrat Mohani Girls High School:** S-69, Garden Reach Road, Kolkata-700024 C/o West Bengal Urdu Academy ➡**Anjuman Islamia:** Chowk Bazar P.O. & Distt.- Darjeeling C/o West Bengal Urdu Academy ➡**Islamic Welfare Society:** Wimberly Gunj P.O. , South Andaman-744206 Ph: 03192-246191, 234741.

تفصیل کے لیے رابطہ قائم کریں:

NATIONAL COUNCIL FOR PROMOTION OF URDU LANGUAGE

Ministry of Human Resource Development, (Deptt. of Secondary and Higher Education), Govt. of India
West Block - 8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi-110 066.
Tel.: 011-26169416, 26109746 Fax: 011-26108159 E-mail: urducourse@rediffmail.com

انجم مانپوری

میر کلّو کی گواہی

احسن اپنے گواہوں کے نہ آنے کی وجہ سے مقدمہ کی تاریخ بڑھانے کے لیے مہلت کی درخواست دے کر بار لائبریری میں اطمینان سے بیٹھا ہوا اپنے وکیل سے باتیں کر رہا تھا کہ اس کا کارپرداز گھبرایا ہوا پہنچا اور بولا کہ گواہی کی پکار ہو چکی ہے، حاکم نے مہلت کی درخواست نامنظور کر دی، گواہ حاضر نہ ہوں گے تو مقدمہ خارج کر دیا جائے گا۔ احسن کی بدحواسی دیکھ کر اس کے وکیل نے کہا کہ گھبرانے کی کون سی بات ہے، گواہی دینے والوں کی یہاں کمی نہیں۔ چنانچہ فن گواہی کے مشہور ماہر اور پیشہ ور گواہوں کے استاد میر کلو صاحب بلائے گئے۔ وکیل صاحب نے احسن سے پانچ روپئے لے کر ان کے حوالے کیے اور ساتھ لیے اجلاس پر پہنچ گئے۔ میر صاحب حاکم کو سلام کر کے کٹہرے میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ احسن سخت متحیر تھا کہ مقدمہ کی حالت سے میر صاحب بالکل واقف نہیں، مدعا علیہ کون ہے؟ کیا نام ہے، کتنی رقم کا دعویٰ ہے، نہ کچھ بتایا گیا نہ اظہار کی کوئی تعلیم دی گئی۔ آخر یہ اظہار کریں گے تو کیا؟ غریب سمجھا کہ مقدمہ ہوا چوپٹ۔ فریق کے وکیل کو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ احسن کا کوئی اصلی گواہ نہیں آیا ہے۔ میر کلو کو کٹہرے میں دیکھ کر اور بھی خوش ہوا کہ یہ بھاڑے کا ٹٹو کہاں تک چلے گا؟ اگرچہ وکیل کے سوالات سے مقدمہ کی نوعیت کا اندازہ کچھ میر صاحب نے اپنی ذہانت سے لگا لیا اور یہ بھی سمجھ گئے کہ احسان علی خاں اصلی مقروض کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب بہ حیثیت وارث اُن کے بیٹے شاہد خاں پر یہ نالش دائر کی گئی ہے، لیکن احسان علی خاں جنھوں نے تمسک لیا تھا، ان کی صورت شکل، وضع، عمر سے واقفیت نہ ہونے کے باعث دل میں کچھ سوچنے لگے کہ فریق کے وکیل نے جرح کے سوالات شروع کر دیے۔ میر صاحب دروغ حلفی کے جرم میں ایک بار سزا پا چکے تھے اس لیے پہلا سوال ان سے یہی کیا گیا۔

وکیل : میر کلو صاحب! آپ کبھی جیل کی بھی سیر کر آئے ہیں؟

میر صاحب: آج کل کون ملک کا خادم ایسا ہے جو جیل سے نہ ہو آیا ہو۔

وکیل : آپ کو ملک کی کس خدمت کے صلہ میں یہ فخر حاصل کرنے کا موقع ملا؟

میر صاحب: وہی قانون شکنی۔

وکیل : کس قانون کو توڑنے کی خدمت آپ نے اپنے ذمہ لی تھی؟

میر صاحب: گاندھی جی نے نمک کے قانون کو توڑنے کا بیڑا اٹھایا تھا اور بعض لیڈروں نے جنگلات کے قانون کی خلاف ورزی کو اپنے ذمے لیا۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ ضرورت قانون شہادت کی اصلاح کی ہے اس لیے قانون شکنی کے لیے میں نے اس کو منتخب کیا۔

وکیل : (حاکم کو مخاطب کر کے) حضور! یہ دروغ حلفی کے جرم میں سزا پا چکے ہیں مگر اپنی زبان سے صاف اقرار نہیں کرنا چاہتے۔

حاکم : تو آپ اس فیصلے کی نقل داخل کر سکتے ہیں۔ دوسرا سوال کیجیے۔

وکیل : کیوں میر صاحب! احسان علی مرحوم کو آپ جانتے تھے؟

میر صاحب: اے حضور! جاننے کی ایک ہی کہی، خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے، ہم دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ نہ مجھے ان کے بغیر آرام نہ ان کو میرے دیکھے بغیر چین۔

وکیل : اُن کی عمر کیا تھی؟

میر صاحب: یہی تیس اور ساٹھ کے درمیان ہی تھی۔

وکیل : یہ تیس اور ساٹھ کے درمیان کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ صاف کہیے وہ بوڑھے تھے یا جوان؟

میر صاحب: عمر کے لحاظ سے تو بہت زیادہ بوڑھے نہیں تھے مگر اکثر بیمار رہنے کی وجہ سے بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔

وکیل : بال سفید تھے یا سیاہ؟

میر صاحب: نزلہ کی وجہ سے بال سفید ہو گئے تھے لیکن جب خضاب لگاتے تھے تو جوان معلوم ہوتے تھے۔

وکیل : رنگ گورا تھا یا کالا؟

میر صاحب: نہایت ہی گورے چٹے آدمی تھے، لیکن دبی بیماری کی وجہ سے رنگ کچھ سانولا سا ہو گیا تھا۔

وکیل : لانبے تھے یا ناٹے؟

میر صاحب: قد تو لانبا تھا لیکن کمر جھک جانے کی وجہ سے ناٹے معلوم ہوتے تھے۔

وکیل نے جھلا کر کہا کہ سوال کا صاف جواب کیوں نہیں دیتے۔ یہ کیا کہ لانبے تھے اور ناٹے بھی، گورے بھی اور سانولے بھی، بال سفید بھی تھے اور سیاہ بھی۔ اس سے حلیہ کا کہیں صحیح اندازہ مل

سکتا ہے؟

میر صاحب: جناب خفا ہونے کی تو کوئی بات نہیں، ایک دو روز کی ملاقات ہوتی تو البتہ اس وقت کی خاص وضع اور صورت کو بیان کرتا۔ برسوں رات دن کا ساتھ رہا، جن مختلف حالتوں میں میں نے ان کو دیکھا صاف صاف کہہ دیا۔

وکیل: اچھا، احسان مرحوم داڑھی بھی رکھتے تھے یا نہیں؟

میر صاحب: وہ عجیب آزاد وضع اور رندانہ مشرب کے آدمی تھے۔ جی میں آیا تو چاروں ابرو کا صفایا بول دیا اور کبھی داڑھی بڑھائی تو خواجہ خضر کو بھی مات دے دی۔

وکیل: فضول گوئی کی ضرورت نہیں۔ میں نے پوچھا تھا کہ داڑھی رکھتے تھے یا نہیں۔ صرف ''ہاں'' یا ''نہیں'' کہہ دیتے۔ اس کے علاوہ کچھ زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا بھر کے قصے سے ہمیں مطلب نہیں۔

میر صاحب: بہتر۔ آئندہ ان ہی دو لفظوں میں جواب دوں گا۔

وکیل: احسان علی مرحوم برابر رہتے کہاں تھے؟

میر صاحب: جی ہاں۔

وکیل: یہ ''جی ہاں'' کیا، میں پوچھتا ہوں کہ کہاں رہتے تھے تو آپ فرماتے ہیں ''جی ہاں'' یہ سوال کا جواب ہوا؟

میر صاحب: جناب ہی نے فرمایا تھا کہ جواب میں صرف ''ہاں'' ''نہیں'' کہو۔

وکیل: میں نے ہر سوال کے لیے تھوڑے ہی یہ جواب بتلایا تھا، اچھا اب کہیے کہ وہ کہاں رہتے تھے؟

میر صاحب: اپنے مکان میں۔

وکیل: لاحول ولا قوۃ! عجیب سمجھ ہے۔ میرا اس سے مطلب یہ ہے کہ شہر میں رہتے تھے یا دیہات میں؟

میر صاحب: دونوں جگہ۔ کبھی شہر کبھی دیہات۔

وکیل: دیہات میں ان کا مکان کس رُخ کا ہے۔ آپ تو وہاں بھی ساتھ ساتھ جاتے ہوں گے؟

میر صاحب: جی ہاں۔ برابر ساتھ دیہات بھی جایا کرتا تھا۔

وکیل: اصل سوال کو آپ کھا بیٹھے۔ دیہات میں ساتھ رہنے کو میں نہیں پوچھتا۔ اس کا جواب دیجیے کہ وہاں مکان کس رُخ کا ہے؟

میر صاحب: (اتنی دیر میں جواب سوجھ گیا) شہر میں رہنے والوں کا دیہات میں اکثر دماغ چکرا جاتا ہے، وہاں جب جب گیا سمت کا مجھے صحیح پتہ ہی نہ لگا۔

وکیل: یہ روپے کس کام کے لیے انھوں نے لیے تھے؟

میر صاحب: اپنی ضرورت کے لیے۔

وکیل: کون سی ضرورت، کیا کوئی خاص ضرورت آپڑی جو بغیر قرض لیے کام نہیں چلتا؟

میر صاحب: وہ نہایت ہی اولوالعزم تھے، خاص اور عام دونوں ضرورتیں ان کے لیے ایک تھیں۔ اپنے پاس دو چار ہزار روپے رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔

وکیل: انھوں نے روپے کب لیے؟

میر صاحب: ضرورت جب پڑی۔

وکیل: کتنے دن ہوئے؟

میر صاحب: تین سو ساٹھ دنوں کا ایک سال ہوتا ہے۔ اب حساب کرنا اور جوڑ کے بتانا کہ سب ملا کر کتنے دن ہوئے ذرا مشکل ہے۔

وکیل: دنوں کو جوڑ کر بتانے کو میں نہیں کہتا۔ یہ بتلائیے کہ کتنے سال ہوئے۔

میر صاحب: تمسک کی مرقومہ تاریخ کو دیکھ کر آپ بھی جوڑ سکتے ہیں کہ کتنے سال ہوئے؟

وکیل: تو صاف کہیے کہ ہمیں یاد نہیں۔

میر صاحب: جی ہاں پڑھنا چھوڑے ہوئے زمانہ ہوگیا۔ اب حساب واقعی یاد نہیں۔

وکیل: حساب کے بھولنے یا یاد رکھنے کا سوال نہیں۔ تمسک کب لکھا گیا تھا، کتنا زمانہ ہوا یہ یاد ہے یا نہیں؟

میر صاحب: زمانہ کے بارے میں جو آپ پوچھتے ہیں تو جہاں تک مجھے یاد آتا ہے انھوں نے اپنی زندگی ہی کے زمانے میں قرض لیا تھا۔

وکیل صاحب اس اَول فول جواب سے سمجھ گئے کہ مقدمے کے متعلق یہ حضرت کچھ بھی نہیں جانتے، صرف دفع الوقتی کر رہے ہیں لیکن غصہ تو اس کا تھا کہ اور باتوں کے جاننے کا کیا ذکر، مدعا علیہ کی صورت تک نہیں دیکھی اور برسوں کی ملاقات ایک طرف سبھی رات دن ایک ساتھ رہنے کا دعویٰ کیا جا رہا ہے اور اس پر کہیں سے گرفت میں نہیں آئے۔ آخر سوچ کر ایک ایسا سوال کیا جس سے وکیل صاحب کو یقین تھا کہ واقفیت اور دوستی کا سارا بھانڈا ہی پھوٹ جائے گا۔ وکیل صاحب نے سوال کیا۔

وکیل: کہیے میر صاحب۔ احسان علی صاحب مرحوم سے اور آپ سے

دلی دوستی تھی، برسوں ایک ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے، ان کا حرف تو آپ ضرور پہچانتے ہوں گے؟

میر صاحب: مرحوم میں یہی تو ایک کمال تھا جس پر وہ برابر فخر کرتے تھے۔ وہ نہایت ہی خوش نویس ہفت قلم تھے۔ ہمیشہ مختلف شان سے لکھا کرتے تھے۔ قلم پر اتنا اختیار تھا کہ ان کا ایک خط کبھی دوسرے سے نہیں ملا۔

اس جواب کے بعد وکیل صاحب نے سپر رکھ دی۔ دو بجے سے مقدمہ شروع ہوا تھا، چار بجنے میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے۔ حاکم نے مسکرا کر وکیل سے پوچھا: اور کچھ پوچھنا ہے، وکیل صاحب نے کہا: جی نہیں۔ لیکن یکا یک ایک بات یاد آگئی۔ حاکم سے کہا: حضور صرف ایک سوال کر کے جرح ختم کر دیتا ہوں۔ تمسک کے کاغذات میں ایک جگہ احسان علی مرحوم کے مرض الموت کا ضمناً تذکرہ تھا، اس کو دماغ میں رکھ کر وکیل صاحب نے سوال کیا۔

وکیل : میر صاحب یہ تو بتایئے کہ احسان علی خاں مرحوم مرے کس بیماری سے؟

میر صاحب: (رونی صورت بنا کر) ہائے رونا تو اسی کا ہے کہ ان کے علاج میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ حکیم، وید، ڈاکٹر سب کا علاج کیا گیا مگر کسی کو اصل مرض کا پتہ ہی نہیں لگا۔ کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔ ''چوں قضا آید طبیب ابلہ شود'' جناب وکیل صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ ان کو موت کی بیماری تھی۔

چار بج چکے تھے۔ اجلاس برخاست ہوا۔ احسن کو دوسرے روز اپنے گواہوں کے لانے کے لیے کافی موقع مل گیا اور یہ صرف میر صاحب کی بدولت ہوا۔ اس روز سے ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ گواہوں کے سچے ہونے سے زیادہ ذہین اور حاضر جواب ہونے کی ضرورت ہے۔

□□□

ہری بھری دنیا کے لیے

مصنف: ایرا اسکینہ/ مترجم: طلعت گل

ایک دلچسپ سائنس فکشن جس میں دوسری دنیا کی مخلوقات کے ساتھ مل کر ہماری دنیا کے بچے ایک مہم پر روانہ ہوتے ہیں اور اس میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

صفحات: 118، قیمت: -/28 روپے

شہر میں ایک جنگل

مصنف: کمارن ست سیوم/ مترجم: عباس آصف

چینئی (مدراس) غالباً دنیا کا واحد شہر ہے جس کی حدود کے اندر حقیقی معنوں میں جنگل کا وجود ملتا ہے۔ اس کتاب میں آئی آئی ٹی چینئی کے جنگل میں مصنف اور اس کے دوستوں نے جو تجربے کیے انھیں افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب سے جنگل کے چرند پرند اور دیگر حشرات الارض کے ساتھ ساتھ مختلف قدرتی اشیا سے متعلق بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

صفحات: 75، قیمت: -/19 روپے

لُسوما

مصنف: منعیو ہمکٹ/ مترجم: اقبال مہدی

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہماری دنیا کو نت نئی تبدیلیوں سے ہمکنار کر رہی ہے۔ بیل گاڑی سے ترقی کر کے آج انسان مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ اس کتاب میں ان ترقیات کے پیش نظر اب سے ایک ہزار سال بعد کی دنیا کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 102، قیمت -/23 روپے

مکمل موصلیت

مصنف: دلیپ۔ ایم۔ سالوی/ مترجم: گوہر رضا

مکمل موصلیت (سپر کنڈکٹیوٹی) دور جدید کی ایک اہم ایجاد ہے جس سے برقی توانائی کے میدان میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ اس کتاب میں مکمل موصلیت سے متعلق تمام تفصیلات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ایجاد کی کہانی بھی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 24، قیمت: 10 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

خواجہ احمد فاروقی

غالب کی دلّی

غالب کی دلی عالم میں انتخاب تھی۔ سرسول اسر کے الفاظ میں چین کے ساحل سے لے کر قسطنطنیہ تک کوئی شہر دید و دانش میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ یہ صرف شہر نہیں ایک بڑی تہذیب کا مرکز اور علم وفن کا گہوارہ تھا۔ ہماری گنگا جمنی تہذیب نے یہیں پرورش پائی تھی۔ معمولی بولیوں کو ادب کی کرسی نشینی کا شرف یہیں حاصل ہوا تھا۔ گیسوئے اردو یہیں سنوارے گئے تھے۔ حاتم سے لے کر حالی تک تمام اسالیب یہیں وجود میں آئے تھے۔ یہیں تصوف نے انسانیت اور دردمندی کا ایک وسیع تر تصور پیش کیا تھا۔ علم حدیث نے یہیں ترقی کی اعلیٰ منزلیں طے کی تھیں۔ علم طب نے یہیں مسیحائی کی تھی۔ یہیں علم و ادب کی شمع کو اس شان سے فروزاں کیا گیا تھا کہ دور دور تک تاریکیاں چھٹ گئیں۔ یہیں علم دین و شعر و حکمت، طب اور تاریخ و نجوم میں وہ معیار قایم کیے گئے کہ غرناطہ و بغداد کی یاد تازہ ہوگئی۔

سلطنت مغلیہ کی حیثیت ایک عظیم الشان درخت کی سی تھی جس کی جڑیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بہادر شاہ اول کے زمانے سے لے کر نادر شاہ کے حملے تک اس کے ٹہنے ٹوٹ کر گرتے تو رہے لیکن اس کی جڑوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ مغلوں کی بربادی دراصل 1739 سے شروع ہوتی ہے۔ نادر شاہ کے حملے نے ان کی کمر توڑ دی اور بقول حضرت شاہ ولی اللہ ”از سلطنت بجز نامے باقی نماند“۔ نادر شاہ نے ہندوستانیوں کا وہ ستھراؤ کیا کہ سڑکوں پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ بستیاں ویران اور بے چراغ ہوگئیں۔ ایک وقت تو ایسا آگیا تھا کہ مسلمانوں نے جوہر کی رسم ادا کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مال غنیمت بھی جو ہاتھ لگا اس کی مالیت آٹھ کروڑ سے کم نہ تھی۔ یہ دولت ایک دن کی نہیں، آٹھ پیڑھیوں کی جمع کی ہوئی تھی۔ آنندرام مخلص کا خیال ہے کہ صرف جواہرات کی قیمت پچاس کروڑ سے زیادہ ہوگی۔ جان کا نقصان اس سے زیادہ تھا۔ ایرانی مورخین کا اندازہ ہے کہ اس ہنگامہ و آشوب میں تیس ہزار سے کم آدمی تہہ تیغ نہ ہوئے ہوں گے۔

نادر شاہ کی غارت گری کے بعد لوٹ کھسوٹ کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ جاٹ مرہٹے، روہیلے اور فرنگی سب ہی ظلم و ستم پر آمادہ تھے۔ ہر چرن داس مصنف گلزار شجاعی نے جاٹ گردی کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی غارت گری سے ڈر کر دلی کے باشندے اس طرح مارے مارے پھرتے تھے جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے تھپیڑے کھا رہا ہو۔ مرہٹوں کے متعلق گنگا رام نے لکھا ہے کہ وہ دیہاتوں کو لوٹتے۔ لوگوں کے ہاتھ، ناک، کان کاٹ لیتے اور خوب صورت عورتوں کو رسیوں میں باندھ کر لے جاتے۔ اس زمانے میں احمد شاہ ابدالی نے 1747 سے 1769 تک نو مرتبہ ہندوستان کو زیر و زبر کیا اور کوئی چیز خوردنی اور پوشیدنی نہیں چھوڑی۔ چھتیں گرادیں، کسی کے گھر میں پوشش ستر اور قوت یک روزہ بھی باقی نہیں رہی۔

ان طوفانوں میں عوام خس و خاشاک سے زیادہ مجبور اور بے دست و پا تھے۔ ہر زبردست کے گھوڑے ان کے کھیتوں کو پامال اور ہر جابر امیر کے سپاہی ان کے گھروں کو بے چراغ کر سکتے تھے۔ روزی کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ صبح کو ملی تو شام کی خبر نہیں۔ دست کار، صناع، کسان، مزدور، وضیع و شریف سب ہی پریشان اور مضمحل تھے۔ خود شاہی خاندان پر تین تین وقت کے فاقے گزرتے تھے اور ”سلاطین“ کی حالت فقیروں سے بھی بدتر تھی۔ نہ جسم پر کپڑا تھا اور نہ پیٹ میں روٹی۔

مرزا رفیع سودا نے شہر آشوب میں لکھا ہے کہ اب نوکری نہیں ملتی۔ اگر گھوڑا جو کوتل اور مزجھرا ہے، لے کر گئے بھی اور نوکری مل بھی گئی تو تنخواہ نہیں ملتی۔ افلاس کا یہ عالم ہے کہ علف و دانہ کی خاطر:

شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یاں ہے

سودا کا شعر ہے۔

روپیہ کی شکل تو دیکھی نہیں خدا جانے
کہ اس زمانے میں چپٹا بنے ہے وہ یا گول

سال سال بھر کی ملازمت کے بعد بھی ایک حبہ تنخواہ کا وصول نہیں ہوتا۔ سپاہیوں پر ہی موقوف نہیں، ہر پیشے شاعری و ملائی، خطاطی و صناعی سب کا یہی حال تھا۔ جاگیرداری اور اجارہ داری کی لعنتوں نے آسائش اور اطمینان ختم کر دیا تھا۔ سیاسی انتشار اور اقتصادی بدحالی کے اس اندھیرے میں انگریز جن

● خواجہ احمد فاروقی کا شمار ہمارے سربرآوردہ نقادوں اور محققین میں ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے غالب کی حیات، شخصیت اور کارناموں کے ساتھ ساتھ ان کے عہد پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ 148 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 53 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40 فیصد خصوصی رعایت دیتی ہے۔

کے پیچھے صنعتی انقلاب تھا اور تاریخ کی بڑھتی ہوئی قوتیں تھیں۔ اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جما رہے تھے۔ ہندوستان کی لوٹ ہی سے ان کے مشینی انقلاب میں جان پڑی تھی۔ مصحفی نے لکھا ہے :

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

انگریزوں نے 1707 میں بنگال پر اور 1799 میں میسور پر قبضہ کر کے ہماری اقتصادی شہ رگ کو کاٹ دیا تھا۔ اور وہ روز بروز اس مامن وفا یعنی دہلی کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ بقول مصحفی:

بس قلعہ کے نیچے ہی تک ایک امن و اماں ہے

چنانچہ 1803 میں لارڈ لیک کی فوجیں فاتحانہ پرچم کے ساتھ دلی تک پہنچ گئیں اور انگریزوں نے ضعیف العمر اور نابینا شاہ عالم کو جس کی حکومت بلا مبالغہ دہلی سے پالم تک باقی رہ گئی تھی، مرہٹوں سے لے کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ سرجی ارر جن گانو کے صلح نامے کی رو سے سندھیا نے دوآب کا سارا علاقہ مع آگرہ اور دہلی کے، انگریزوں کے سپرد کر دیا اور وہ تیموری جاہ و جلال جس کے آگے کبھی شان عجم اور شوکت روم حقیر معلوم ہوتی تھی نیست و نابود ہو گیا اور اکبر شاہ ثانی کے متعلق یہ جملہ ضرب المثل بن گیا تھا۔

''اکبر شاہ ثانی، چولھے آگ نہ گھڑے پانی۔'' دوراں تیمور یہ کے آخری چشم و چراغ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں مغلوں کی حکومت لفظاً اور معناً سمٹ کر قلعہ کی چہار دیواری تک رہ گئی تھی۔

لیکن دلی مٹنے پر بھی ہندوستان کا قلب وجگر اور ایک عظیم الشان تہذیب کی نشانی تھی۔ ہر طرف اس کی تہذیب کا سکہ رواں تھا اور حضرت دہلی کی تعظیم و تکریم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ 1813 بلکہ اس کے بعد بھی ہندوستان کے فرماں روا اور راجے مہاراجے اپنی تخت نشینی کو اُس وقت تک قطعی نہیں سمجھتے تھے جب تک دہلی کے مجبور اور بے دست و پا بادشاہ کی مہر توثیق ثبت نہ ہو جائے۔

ان انتشاری رجحانات سے یہ سمجھنا کہ اس زمانے کی تاریخ محض شورش پسندی یا عیش کوشی کی داستان ہے یا اس زمانے کا ادب، رات اور زلف کی کہانی ہے، صحیح نہیں ہے۔— اجتماعی انحطاط اور سیاسی زوال کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن ابھی انفرادی زوال مکمل نہیں ہوا تھا۔ وقت کی ان عام مایوسیوں میں غیرت اور شجاعت، ایثار و کرم، علم و فن، محبت اور رواداری کی حیرت انگیز مثالیں مل جاتی ہیں۔ غالب کی زندگی اور شاعری کو اسی سیاسی، معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ اس بڑے نقشے میں بادشاہوں اور امیروں کی غلط عشقی یا رنگین مزاجی اتنی اہم نہیں جتنی غالب کی حکیمانہ ذہانت اور شگفتہ متانت۔ تاریخ میں ایک محمد شاہ، ایک ابواسحاق، ایک لوئی (سولھواں)

ہمیشہ ہوا ہے۔ اس کی پرچھائیں اور اس کا نعرہ ہائے ہو ذرا دیر میں فضا میں تحلیل ہو گیا ہے۔ لیکن جس چیز کو زوال نہیں وہ اس زوال پذیر معاشرے میں غالب کا ثبات قدم، جینے کا سلیقہ اور اقدار عالیہ پر ایمان محکم ہے۔

شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے کہ ''مغلوں کے جاہ و جلال کا اصل گہوارہ شاہ جہاں آباد تھا لیکن عجیب اتفاق ہے کہ نہ صرف ان کے فن تعمیر کا شاہکار اکبر آباد میں ہے بلکہ ان کے سب سے بڑے شاعر اور ان کی تہذیب و تمدن کے بہترین ترجمان کا مولد بھی وہی بلدۂ حسن و شعر ہے۔''

مرزا اسد اللہ خاں غالب، شب ہشتم، ماہ رجب 1212 ہجری مطابق 27 دسمبر 1797 کو آگرہ میں پیدا ہوئے اور 15 فروری 1869 کو دہلی میں پیوند خاک ہوئے۔ ان تہتر برس اور چار مہینے کی داستان ہمارے خطبات کا اصل موضوع ہے۔ جس کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(1) غالب کی ولادت سے 1857 کے انقلاب تک اور
(2) 1857 سے غالب کی وفات تک

غالب ارض تاج میں پیدا ہوئے جہاں محبت کی سب سے بڑی یادگار ایک خواب مرمریں کی شکل میں موجود ہے۔ یہیں غالب کی شاعری کی ابتدا ہوئی جس کا ہر نقش فریادی ہے اور ہر شعر پلکوں سے ڈھلکتا ہوا آنسو۔ مرزا غالب کی والدہ اسی شہر آگرے کے ایک معزز گھرانے کی تھیں۔ وہ پانچ برس کے تھے کہ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ ریاست الور میں مارے گئے۔ یتیم ہونے کے بعد ان کی نگرانی ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے سپرد ہوئی جو اس وقت مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے گورنر (صوبے دار) تھے۔ جب لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر آگرہ پر قبضہ کر لیا تو یہ بے روزگار ہو گئے اور ان کی جگہ ایک انگریز کمشنر مقرر ہو گیا لیکن نواب احمد بخش خاں نے جن کی بہن مرزا نصر اللہ بیگ سے منسوب تھیں اور جن کے لارڈ لیک سے دوستانہ مراسم تھے ان کو کہہ سن کر انگریزی فوج میں چار سو سوار کا رسالدار مقرر کرا دیا اور دو پرگنے بھی ذات اور سوار کے خرچ کے لیے عنایت ہوئے۔ لیکن ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ نصر اللہ بیگ خاں کا بھی انتقال ہو گیا۔ غالب نے یہ ابتدائی زمانہ اپنے چچا کے یہاں نہیں بلکہ نانا کے یہاں گزارا۔ مولانا حالی یادگار غالب میں لکھتے ہیں۔ ''مرزا عبداللہ بیگ نے بطور خانہ داماد کے اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی اور ان کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی۔''

ان کی ننہال بہت آسودہ حال تھی اور آگرہ میں انھیں ہر قسم کی آزادی اور آسائش میسر تھی۔ آگرہ میں غالب کا ماحول شاہد و شعر و شراب کا تھا لیکن اس لہو ولعب کے باوجود انھوں نے مروجہ تعلیم بھی حاصل کی اور منطق و فلسفہ ہیئت اور طب میں اچھی خاصی دسترس بہم پہنچا لی تھی۔ فارسی سے انھیں مناسبت

اصلی تھی۔ ''تذکرۂ گلشن بے خزاں'' میں لکھا ہے کہ انھوں نے شیخ معظم اور نظیر اکبرآبادی سے بھی درس لیا تھا۔ مرزا غالب نے یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے فارسی کے غواص ملا عبدالصمد ہرمز سے جو جاماسپ عہد اور بزرجمہر عصر تھا، دو برس تک سیکھے لیکن مولانا حالی کے برخلاف قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ ملا عبدالصمد فرضی نام ہے اور اس کا کوئی وجود خارجی نہیں تھا۔

تیرہ برس کی عمر میں مرزا غالب کی شادی ذوق کے شاگرد اور نواب احمد بخش خاں کے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی سے ہوگئی اور اس طرح ان کا تعلق دہلی کے ایک ایسے ممتاز گھرانے سے قائم ہوگیا جو نہ صرف دولت مند تھا بلکہ شعر و ادب میں بھی ذی حیثیت تھا۔

غالب پانچ چھ سال کی عمر سے دہلی آتے جاتے تھے لیکن پندرہ سولہ برس کی عمر میں مستقلاً دہلی میں اقامت گزیں ہوگئے۔ اس کے بعد بھی آگرہ آنے جانے کا سلسلہ رہا۔ غالب کے چچا نصراللہ خاں کے انتقال کے بعد ان کی پنشن نواب احمد بخش خاں کی جاگیر میں شامل ہوگئی تھی اور وہی ان کے ورثا کے کفیل بھی تھے۔ دوسرے ان کی بھتیجی سے غالب کی شادی ہوگئی تھی اس لیے وہ آگرہ چھوڑ کر دلی میں رہنے لگے تھے۔

غالب اس زمانے میں دہلی آئے جب دہلی میں نسبتاً امن چین تھا۔ بقول مولانا حالی ''حسن اتفاق سے دارالخلافہ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری اور شاہ جہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتی تھیں۔

مولانا حالی نے لکھا ہے:

''اگرچہ جس زمانے میں کہ پہلی ہی بار راقم کا دلی جانا ہوا اس باغ میں پت جھڑ شروع ہوگئی تھی۔ کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر جو باقی تھے اور جن کے دیکھنے کا مجھ کو ہمیشہ فخر رہے گا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا۔'' سرسید نے ''تذکرۂ اہل دہلی'' میں لکھا ہے:

''ہر ایک شخص ہزار ہزار خوبی کا مجموعہ اور لاکھ لاکھ ہنروں کا گلدستہ ہے۔''

مصر کے مشہور فاضل علامہ رشید رضا کو اعتراف کرنا پڑا کہ اگر ہندی علما علم حدیث کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو یہ علم ختم ہو چکا ہوتا۔ ان محدثین میں حضرت شاہ عبدالعزیز کا نام نامی خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہے۔ ان کا یہ احسان معمولی نہیں ہے کہ انھوں نے انگریزی علوم سیکھنے کی ترغیب دی لیکن اسی کے ساتھ انگریزی تسلط کی مخالفت بھی کی اور اس پورے علاقے کو جو لارڈ لیک کی فتح یابی کے بعد انگریزوں کے زیرنگیں آگیا تھا، دارالحرب قرار دیا۔ انھوں نے قومیت کا وسیع تر تصور پیش کیا جس میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے۔ دہلی مٹنے پر بھی ہندوستان کا دل تھی اور اس کے علما کی راست روی اور غیرت قومی یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ دہلی پر انگریزوں کا تسلط ہو۔ ان کا فتویٰ جہاد نہ مرہٹوں کے خلاف تھا نہ سکھوں کے۔ حالاں کہ ان دونوں طاقتوں کا اثر بہت دور تک پھیل گیا تھا۔ 1845 میں رنجیت سنگھ کے مرنے کے بعد انگریزوں نے پورے پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد جہادی تحریک کا رخ کلیتاً انگریزوں کے خلاف ہوگیا اور 1850 سے 1863 تک انگریزوں نے بیس دفعہ 60ہزار لشکر کی مدد سے جہادیوں کا مقابلہ کیا لیکن یہ تحریک کچلی نہیں جا سکی۔

وہابی علما کی تمام تر سعی یہ رہی کہ اسلام کو خارجی عناصر سے پاک کیا جائے لیکن وہ ہندوؤں سے اتحاد کرنے اور ان سے مدد لینے کے دل سے حامی تھے۔ ان کی رواداری اور اتحاد پسندی کا یہ اثر تھا کہ ہندو مہاجن، ہندو راجا، ہندو تحصیل دار، ہندو سامعین اور ہندو مترجمین سب ان کی خاموش تائید کرنے والوں میں تھے۔

وہابی تحریک مذہبی بھی تھی، سیاسی بھی اور ادبی بھی ــــ اس تحریک نے وہ آزادیٔ جرأت اور بے باکی پیدا کی جو اس سے پہلے اُردو ادب میں نہیں ملتی۔ وہابی علما اور مرزا غالب کے راستے الگ تھے لیکن جس آزادی اور بے باکی سے ان علما نے مذہب، رسوم اور معاشرت میں تقلید کے خلاف جہاد کیا اور اصنام خیالی کو توڑا اسی آزادی سے مرزا غالب نے فن لغت اور فن شعر میں بڑے بڑے استادوں پر نکتہ چینی کی ہے اور اس بات پر زور دیا کہ اگلے جو کچھ کہہ گئے ہیں وہ وحی اور الہام نہیں ہے اور نہ ہر پرانی لکیر صراط مستقیم ہے۔

نادر شاہ کا ایلچی جب دہلی آیا تو کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ کے منشیوں نے تین برس اس سوچ میں صرف کر دیے تھے کہ شاہ ایران کو کیا القاب لکھے جائیں۔ اس وقت القاب و آداب مقرر تھے اور تمام اوصاف اسم تفضیل کے صیغے میں لکھے جاتے تھے لیکن جب نئی ضرورتوں کی صبح طلوع ہوئی تو یہ تکلفات بھی ختم ہوگئے۔ غالب نے جدید نثر کی طرح ڈالی اور سرسید آدم نثر جدید کہلائے۔

شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز دونوں خواجہ میر درد کے شاگرد تھے ان کا تصوف انسان دوستی کے آفاق گیر تصور پر مبنی ہے۔ مرزا مظہر جانِ جاناں تو ہندوؤں کو موحد اور صاحب کتاب سمجھتے تھے۔ غالب کے یہاں بھی ''اصل چیز عقیدے سے وفاداری ہے، ملتیں اہم نہیں۔ ان کے مٹنے سے جو ایمان بنتا ہے وہ اہم ہے۔''

لکھتے ہیں: ''میں تو بنی آدم کو، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور بھائی گنتا ہوں۔''

انیسویں صدی کو عام طور پر زوال کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ سیاسی انحطاط سے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے لیکن ہماری تہذیب کو ابھی گھن نہیں لگا تھا۔ جہادی تحریک اور تصوف کے نئے مثبت رجحانات اس بات کے گواہ ہیں کہ اس وقت دلی اپنی روایات سے بیگانہ اور روحانی اور اخلاقی ورثے سے بے بہرہ نہیں تھی۔

مٹکاف نے لکھا ہے کہ دہلی میں یہ شوق جہاد اتنا بڑھ گیا تھا کہ بہت سے لوگوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجی اور شہری ملازمتوں سے استعفے دے دیے تھے اور اپنے گھروں سے سربکف نکل کھڑے ہوئے۔ یوں بھی اس زمانے میں علما اور ثقات کمپنی بہادر کی ملازمت کو "حمالی" اور عزت و افتخار سے گرا ہوا سمجھتے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز، میر تقی میر، مرزا غالب اور مومن خاں مومن—— کسی نے بھی انگریز کی ملازمت قبول نہیں کی۔

مومن شاہ عبدالقادر کے شاگرد اور مولانا سید احمد بریلوی کے مرید تھے۔ ان کی شادی دہلی کے نامور خاندان ارشاد وہدایت یعنی خواجہ میر درد کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس لیے خوشامد اور تملق سے پرہیز کرتے تھے اور قصیدہ کو کارِ ہوسِ پیش گاں سمجھتے تھے۔ وہ رند غزل خواں بھی ہیں اور جہاد کے علم بردار بھی۔ یہ تضاد مومن ہی میں نہیں، اس زمانے کی زندگی میں بھی تھا۔ وصلِ شاہدانِ شیریں کے جو تقاضے حرم میں پورے نہیں ہو سکتے تھے وہ دیوان خانے میں پورے ہوتے تھے۔ اس دور میں ایک منا جان، ایک درگابائی صنم، ایک رجو، ایک صاحب جی برابر ملتی ہیں اور رندی وزہد میں وہ بیر نہیں تھا جو آج ہے۔

غالب مومن کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کے ایک شعر پر اپنا پورا دیوان نثار کرنے کو تیار تھے۔ ان کے مرنے پر غالب نے لکھا تھا:

کافر باشم اگر بہ مرگ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم عمر

مومن کے انتقال کے بعد شیفتہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ دونوں میں بڑی دوستی اور محبت کے تعلقات تھے۔ جب مرزا غالب 1847 میں جوئے کے الزام میں قید ہوئے تھے تو شیفتہ ہی نے ان کی مدد کی تھی۔

فرد کا تعلق طبقے سے ہے اور طبقے کا دامن اس کے سماج سے بندھا ہوا ہے۔ غالب کی اچھائیوں اور کمزوریوں کو بھی اسی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ شاہد و شمع و مے و قمار سے ان کا تعلق کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں۔ قمار بازی کے الزام میں وہ ایک دفعہ نہیں دو دفعہ معتوب ہوئے۔ 22/اگست 1841 کے "دہلی اُردو اخبار" میں لکھا ہے:

"سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گزر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے مثل ہاشم علی خاں وغیرہ کے کہتے ہیں بڑا قمار ہوتا تھا۔ تھانے دار قوم سے سید ... مرزا نوشہ ایک شاعر نامی اور رئیس زادہ۔ نواب شمس الدین خاں قاتل ولیم فریزر صاحب کے قرابت قریبہ میں سے ہے ... اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے۔ نہ ادا کریں تو چار مہینے قید۔"

لیکن ان واقعات اسیری سے غالب کی شاعرانہ عظمت میں کچھ فرق نہیں آتا۔ ان کی عظمت کے گوشے وہاں روشن ہوتے ہیں جہاں وہ شخصیت اور گرد و پیش سے گزر کر تاروں کو چھو لیتے ہیں اور کائنات کی وسعتوں میں پہنچ جاتے ہیں۔

شیفتہ بڑے خوش فکر شاعر تھے اور نقد شعر میں بھی امتیاز رکھتے تھے۔ ان کا تذکرہ "گلشن بے خار" میانہ روی اور اعتدال و توازن کے لیے مشہور ہے۔ ان کو 1857 میں غیر معمولی مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ ان کا قیمتی کتب خانہ جل گیا۔ مکانات کو آگ لگا دی گئی اور انگریزوں نے اعانت مجرمانہ کے الزام میں ان کی جاگیر ضبط کر لی اور سات برس کی سزا دی۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں: "مصطفےٰ خاں کا حال سنا ہوگا۔ خدا کرے مرافعہ چھوٹ جائے ورنہ حبس ہفت سالہ کی تاب اس ناز پروردہ میں کہاں۔"

شیفتہ خوش قسمتی سے اپیل میں بری ہو گئے۔ غالب جن کی کوششوں سے شیفتہ کو رہائی ملی تھی ان سے ملنے میرٹھ گئے۔ جائیداد کی واگزاری میں بھی ان کا ہاتھ تھا۔ شیفتہ صبر و رضا کی دولت خاص سے بہرہ مند تھے۔ مالک رام صاحب نے ان کے ضبط و استقلال کے دو عجیب واقعات لکھے ہیں۔ جس زمانہ میں وہ قید میں تھے، پاپیادہ، بیڑی پہنے ایک سڑک سے گزر رہے تھے اس وقت آسمان کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے: "تیری شان کریمی کے قربان۔ اتنی ہی سزا دی، ورنہ میں تو اس سے بہت زیادہ کا مستحق تھا۔"

دوسرا واقعہ انھوں نے منشی ذکاء اللہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ شیفتہ کو سرطان ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے عمل جراحی تجویز کیا۔ وہ آتا اور ناقص گوشت کاٹ کاٹ کے الگ کر دیتا۔ دیکھنے والوں کے دل ہل جاتے لیکن ان کے ماتھے پر شکن تک نہ آتی۔ ایک دن بڑے صاحبزادے محمد علی خاں بے اختیار رونے لگے تو فرمایا "اس جسم خاکی کے زوال پر رونا بڑی کم ہمتی ہے۔"

مفتی صدرالدین آزردہ نے جو خود 1857 کے انقلاب میں چند در چند مصائب کا شکار ہوئے تھے، اپنے مرثیۂ دہلی میں شیفتہ اور صہبائی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ثانی الذکر کے جسم کو توپ سے باندھ کر ان کے پرخچے اڑا دیے گئے تھے۔ آزردہ لکھتے ہیں:

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے
سر ہے اور جوشِ جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر، جی ہی پہ بن آتی ہے
مصطفےٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

غالب اور سرسید کے دوست فاضل عصر مولانا امام بخش صہبائی دلی کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہ فارسی اور اُردو کے بلند پایہ شاعر اور عربی کے زبردست عالم تھے۔ جرم بغاوت میں بقول غالب ''بہت دیر حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف۔ جائیداد ضبط۔ لیفٹیننٹ گورنر نے از راہ ترحم نصف جائیداد واگزاشت کی۔''

مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے ''مفتی صاحب کا دیوان خانہ دہلی کے منتخب افراد کا مجمع و مرکز تھا۔ جاڑا گرمی برسات کوئی موسم ہو لیکن شب کی مجلس کوئی قضا نہیں کرتا تھا۔ ہرفن کے اکابر کو وہاں ان کے بہترین وقتوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اگر کوئی نووارد دہلی آتا اور چاہتا کہ دہلی کے سارے فضل و کمال کو بیک مجلس دیکھ لے تو وہ سیدھا مفتی صاحب کے دیوان خانے کا رخ کرتا۔''

اس زمانے میں اکثر مشاعرے ہوتے اور ان میں فارسی اُردو غزلیں پڑھی جاتیں۔ غالب سب میں تو نہ جاتے لیکن جن مشاعروں کا انتظام نواب ضیاء الدین خاں کرتے ان میں اصرار سے چلے جاتے۔ یہ صحبتیں 1857 کی بغاوت میں درہم برہم ہوگئیں اور دتی بیواؤں سے زیادہ دکھیاری ہوگئی :

چمن کے تخت پر جس دن شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اک شور تھا، غل تھا
خزاں کے دن جو دیکھا کچھ نہ تھا جز خار گلشن میں
بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

جس زمانے میں مرزا غالب دہلی آئے ہیں یہاں انگریزی نظم ونسق قایم ہو چکا تھا اور گوشہ میں قفس کے کچھ آرام اور اطمینان بھی تھا۔ تہذیبی زندگی کا شیرازہ جو منتشر ہو گیا تھا، وہ ایک دفعہ پھر بندھ گیا تھا اور اسی کے نتیجے میں وہ رہنما میسر آئے جنھوں نے عہد جدید کی گزرگاہوں کو روشن کر دیا اور ہمیں ایک نئی سادہ زبان، ایک نیا ادب، نئے اصول نقد، ایک نیا نظام تعلیم اور مذہب اور تہذیب کی مدافعت کے نئے ہتھیار دیے۔ ہم نے مغرب کے آگے فوراً سپر نہیں ڈال دی بلکہ آویزش اور پیکار سے لے کر افہام و تفہیم اور مفاہمت و مصالحت کی تمام منزلیں طے کیں۔ یہ غلط فہمی عام ہے کہ انیسویں صدی میں ہندوستان علم وفن سے بیگانہ تھا اور اس پر زوال اور نکبت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن یہ پوری صداقت نہیں ہے۔ کرنل سلیمن نے لکھا ہے:

''دنیا میں ایسی قومیں کم ہوں گی جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جس قدر ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ یہاں سات سال کے درس کے بعد طالب علم کو دستار فضیلت باندھی جاتی ہے اور وہ اسی طرح سقراط، افلاطون، بقراط، جالینوس اور بوعلی سینا کے متعلق گفتگو کر سکتا ہے جس طرح آکسفورڈ کا ایک طالب علم۔''

مرزا غالب کی دہلی میں علما میں شاہ عبدالعزیز اور مولانا فضل حق خیرآبادی اطبا میں حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں اور شعرا میں مومن و شیفتہ اور ذوق وظفر موجود تھے اور ان میں سے ہر ایک کی حیثیت فرد کی نہیں ادارے کی تھی۔

غالب بھی اس عہد کے صاحب نظر دانشوروں میں تھے۔ وہ آگرہ کے خم کدۂ نیاز سے نکل کر دتی آئے تو یہاں شاعروں سے معرکہ آرا ہوئے۔ انھوں نے ذوق کی لسانی تحریک کو مانا لیکن اسے حکیمانہ نظر بھی دی۔ کلکتہ گئے تو وہاں حامیانِ قتیل سے برسرِ پیکار ہوئے اور اس ایرانی ہندی نزاع میں کود پڑے۔ جو فیضی اور عرفی شیخ علی حزیں اور خان آرزو کے زمانے سے جاری تھی۔ مرزا نے اس میں بھی سرگرم حصہ لیا اور بعض ایرانیوں سے خراج تحسین حاصل کیا۔ پھر ان کی پنشن کا قصہ اٹھ کھڑا ہوا جس میں وہ پورے تیس برس تک الجھے رہے۔

مرزا غالب کی شادی ذوق کے شاگرد نواب الٰہی بخش خاں معروف کی لڑکی سے ہوئی تھی جن کے تعلقات دہلی کے نامور شاعروں اور امیروں سے بہت گہرے تھے۔ غالب کو بھی ان محفلوں میں درخور حاصل ہوا اور وہ ان صحبتوں سے پوری طرح فیض یاب ہوئے۔ ذوق کا سکہ صرف معروف ہی کے یہاں نہیں بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی چل رہا تھا۔ غالب کے کلام میں جو سہل ممتنع کا رجحان اور زبان و بیان کے کرشموں کی طرف توجہ ملتی ہے وہ بھی اسی دبستان کا اثر ہے۔

4رجولائی 1850 کو بہادر شاہ ظفر نے حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر غالب کو نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطابات دیے اور پچاس روپئے ماہوار پر شاہانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے کی خدمت سپرد کی۔

16راکتوبر 1854 کو استاد شہ خاقانی ہند ذوق کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی ان کے سپرد ہوئی لیکن ملک الشعرا یا اس طرح کا کوئی خطاب نہیں ملا۔ بہادر شاہ کا سہارا بہت کمزور تھا۔ یہ چراغ معلوم نہیں کب بجھ جائے۔ 1852 میں بہادر شاہ بیمار ہوئے۔ اس وقت غالب کو اپنے

مستقبل کی طرف سے فکر ہوئی اور انھوں نے منشی ہیرا سنگھ کو لکھا:

''از شب عید خاقان رنجور راست۔ حالا دیگر چہ رونما یدومن کہ در سایۂ دیوارش غنودہ ام، چہ رود۔''

11 رمئی 1857 کو بغاوت شروع ہو گئی اور اس کے شعلوں نے دہلی اور پورے اکناف ہند کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

مولانا غلام رسول مہر نے لکھا ہے ''یوں تو غالب کے الم نامۂ حیات کا کوئی ورق بھی ایسا نہیں جس کے بین السطور کی آرائش میں دل وجگر کا خون بے دریغ صرف نہ کیا گیا ہو لیکن اس جلیل القدر انسان کے اندوہ و ماتم کا سب سے بڑھ کر دردناک باب سلطنتِ تیموریہ کے زوال کا وہ خوں چکاں واقعہ ہے جو عام طور پر ''غدر'' کے نام سے معروف ہے۔''

غالب نے اس تہذیب کا مرثیہ بڑے پُر درد الفاظ میں پیش کیا ہے اور رمزی علامتوں کے پیرایے میں ساری خارجی حقیقتوں کو سمو لیا ہے:

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
داماں باغبان وکف گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور وسوز، نہ جوش وخروش ہے
داغ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

دہلی کے حالات کا بہترین ماخذ غالب کا روز نامچہ ''دستنبو''، ان کے خطوط اور وہ اشعار ہیں جن میں ان کے دل کی تمام دھڑکنیں سنی جا سکتی ہیں۔

''دستنبو'' کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ 1857 کی بغاوت میں عوام شریک تھے اور یہ صرف فوجیوں کا برپا کیا ہوا ہنگامہ و آشوب نہیں تھا۔ عوام نے آخری وقت تک دلیرانہ اور مدافعانہ جدوجہد کی اور اجمیری دروازہ اور ترکمان دروازہ یہ سب رزم گاہ میں تبدیل ہو گئے تھے۔ دہلی اب شہر خموشاں میں تبدیل ہو گیا تھا اور پوری مسلمان آبادی شہر بدر کر دی گئی تھی ''شہراز مسلمانان تہی است شبانہ خانہ ہائے ایں مردم، بے چراغ اور روزانہ، روزنِ دیوار ہا بے دود۔''

''دستنبو'' لکھنے کا مقصد اپنی بے گناہی ثابت کرنا اور خلعت وخطاب اور پنشن کی درخواست کرنا تھا۔ پھر بھی اس کا ایک بڑا حصہ ان تکالیف کے بیان پر مشتمل ہے جو فتح دہلی کے بعد مرزا غالب اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کو پیش آئیں اور جن کو انھوں نے بڑے پرسوز انداز میں قلم بند کیا ہے۔ غالب نے آئینہ کو ایک خاص رخ سے پکڑا ہے اور پہلی دفعہ ہندوستانیوں کے مصائب کو غیر ملکی حکمرانوں کے سامنے رکھا ہے۔

غالب اس غدر کے ہنگامے میں مع زن وفرزند، قلزم خون کے شناور رہے اور انھوں نے دروازے سے باہر قدم نہیں رکھا لیکن یہ اتنا بڑا انقلاب تھا کہ اس کے بیان کرنے کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ہزار ہا دوست مر گئے۔ کس کس کو یاد کروں اور کس سے فریاد کروں۔ جیوں تو کوئی غمخوار نہیں۔ مروں تو کوئی عزادار نہیں۔''

مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

''صاحب تم جانتے ہو کہ یہ کیا معاملہ ہے اور کیا واقعہ ہوا۔ وہ ایک جنم تھا جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر ومحبت درپیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کیے۔ اس زمانے میں ایک بزرگ تھے اور ہمارے تمھارے دلی دوست تھے۔ منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر ان کا تخلص۔ نہ وہ زمانہ رہا۔ نہ وہ اشخاص۔ نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط۔ نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔

مرزا غالب نے اپنے خطوں میں بار بار اپنی بے گناہی اور باغیوں سے بے تعلقی ظاہر کی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اس فتنہ وآشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا اور نظر اپنی بے گناہی پر شہر سے نکل نہیں گیا۔''

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔ دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ انھوں نے بہادر شاہ کی خدمت میں سکۂ شعر بھی پیش کیا تھا اور فتح آگرہ کی خوشی میں ایک قصیدہ بھی پڑھا تھا۔ اس لیے ان کی بے گناہی کو بعض نئی شہادتوں کی روشنی میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ غالب نے حسین مرزا کو جون 1859 کے خط میں لکھا ہے:

''یہاں ایک اخبار جو گوری شنکر یا گوری دیال یا کوئی اور غدر کے دنوں میں بھیجتا تھا اس میں ایک خبر اخبار نویس نے یہ بھی لکھی فلانی تاریخ اسد اللہ خاں غالب نے یہ سکہ کہہ کر گزرانا:

بہ زرزد سکۂ کشور ستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی

مجھ سے عندالملاقات صاحب کمشنر نے پوچھا کہ یہ کیا لکھتا ہے میں نے کہا کہ غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر۔ بادشاہ کے بیٹے شاعر۔ خدا جانے کس نے کہا، اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔''

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں:

''میں نے سکہ کہا نہیں اور اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا یہ

گناہ نہیں اور گناہ بھی ہے تو کیا ایسا سنگین ہے کہ ملکہ معظمہ کا اشتہار بھی اس کو نہ مٹا سکے۔ سبحان اللہ گولہ انداز کا بارود بنانا اور توپیں لگانی اور بنک گھر اور میگزین کا لوٹنا معاف ہو جائے اور شاعری کے دو مصرعے معاف نہ ہوں۔''

سوال یہ ہے کہ غالب کے وہ مصرعے کون سے تھے۔ تھے بھی یا نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ جو سکے غالب سے منسوب کیے گئے وہ درحقیقت ان کے نہیں تھے اور اس معاملے میں ان کا اضطراب بجا تھا۔ لیکن انھوں نے سکہ بھی کہا تھا اور قصیدہ بھی گزراتا تھا۔ اس طرح باغیوں سے اخلاص کی بات بالکل نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔

غالب نے ایک قصیدہ بھی 1857 کی بغاوت کے زمانے میں اور فتح آگرہ کی خوشی کے موقع پر پیش کیا تھا۔ منشی جیون لال نے 31/ جولائی 1857 کے ذیل میں لکھا ہے:

''فتح آگرہ کے مژدے سے سب بادشاہ اور اہل قلعہ خوش تھے مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے ایک قصیدہ من تصنیف خود با بادشاہ کی طرح میں پڑھے۔''

جیون لال کے اس بیان کی تائید آگرہ کے اخبار عالم تاب سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

''مرزا نوشہ اور مکرم علی خاں نے 31/ جولائی 1857 کے دن بہادر شاہ کی تعریف میں قصیدے پڑھے۔''

اس سے صاف ظاہر ہے کہ غالب نے عوامی بغاوت کے زمانے میں بہادر شاہ ظفر سے تعلقات منقطع نہیں کیے تھے۔ اس سے ان کی غیرت قومی اور بادشاہ کی ہردل عزیزی دونوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

واقعہ بھی یہ ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے انگریزوں سے لڑائی ضرور لڑی تھی لیکن نہ کوئی بدعہدی کی تھی اور نہ کوئی غداری اور بغاوت کی تھی۔ اس نے تو صرف اس حق پر اصرار کیا تھا جو اس کو گیارہ پشتوں سے ملتا چلا آیا تھا۔ انگریزوں نے جو اس پر دیوان خاص میں 42 دن تک مقدمہ چلایا وہ بھی صریحاً بے انصافی تھی اور قید و بند میں جو مظالم کیے وہ بھی کسی طرح معاف نہیں کیے جا سکتے۔ رنگون میں قید تنہائی تھی، کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ جب بیماری بہت بڑھی تو حکیم کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ دفن کے بعد گوروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھوڑوں سے قبر کو اس طرح زمین کے برابر کر دیں کہ نام و نشان تک باقی نہ رہے انھوں نے اس کی خود پیشین گوئی کی تھی:

پس مرگ، قبر پہ اے ظفر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اسے ٹھوکروں سے اڑا دیا

انگریزوں نے اس بات سے بھی ممانعت کر دی تھی کہ نہ کوئی قبر پر جائے اور نہ فاتحہ پڑھے۔ مرحوم بادشاہ نے ایک شعر میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا تھا۔ فرماتے ہیں:

کوئی آ کے پھول چڑھائے کیوں کوئی آ کے شمع جلائے کیوں
کوئی بہر فاتحہ آئے کیوں میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

غالب نے بہادر شاہ کی وفات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''7/ نومبر 1862 مطابق 14/ جمادی الاول سال حال، جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ اور قید جسم دونوں سے آزاد ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔''

کہنے کو یہ چند لفظ ہیں لیکن ان کے پیچھے درد ہی درد ہے۔ یاس ہی یاس ہے:

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب

بغاوت کے زمانے میں جب جرنیلی حکم نافذ تھا۔ غالب کے بھائی مرزا یوسف کو انگریزوں نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ لیکن غالب نے اس کا ذکر نہیں کیا کہ وہ انگریزوں کی گولی سے ہلاک ہوئے۔ انھوں نے دستنبو میں صرف یہ لکھا ہے:

''19/ اکتوبر کو پیر کے دن وہ کم بخت دربان بھائی کے مرنے کی خوش خبری لایا۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار راہ فنا (یعنی یوسف مرزا) پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ پانی، غسال، رومال، گورکن، اینٹ، چونے، گارے وغیرہ کا ذکر چھوڑیئے۔ یہ بتائیے کہ میں کیسے جاؤں اور میت کو کہاں لے جاؤں۔ کس قبرستان میں سپرد خاک کروں۔ بازار میں اچھا بُرا کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ وہ دو تین شخص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں چہ جائے کہ میت کو شہر سے باہر لے جائیں۔

پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور اس کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہوئے۔ پٹیالے کے ایک سپاہی کو آگے کیا۔ میرے دو نوکروں کو ساتھ لیا اور چل دیے۔ میت کو غسل دیا۔ دو تین سفید چادریں اس گھر سے لے گئے۔ ان میں لپیٹا اور اس مسجد میں جو مکان کے برابر تھی۔ زمین کھودی۔ میت کو اس میں رکھا اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے۔''

18/ ستمبر 1857 کو دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہو گیا لیکن یہ تاریخ کی بڑی ہولناک لڑائی تھی۔ اہل دہلی نے بڑی ہمت اور بہادری سے ایک ایک انچ کے لیے جان دی۔ اور پورا شہر رزم گاہ میں تبدیل ہو گیا۔ ہڈسن نے لکھا ہے کہ ہم ان بدمعاشوں کا صحیح نشانہ مارنے اور توپوں کے تیز چلانے میں مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ فتح کے بعد قتل عام شروع ہو گیا۔ ہر مسلمان کو باغی قرار دیا گیا اور پوری آبادی شہر سے نکال دی گئی۔ یہ تجویز بھی تھی کہ سارے شہر کو تہہ خاک اور جامع مسجد کو مسمار کر دیا جائے تاکہ بقول اوٹرم مسلمانوں کو

عبرت ہو اور ان کے مذہب کی تذلیل ہو۔ یہ بھی تجویز تھی کہ فتح پوری کی مسجد میں فوج کو ٹھہرایا جائے اور زینت المساجد میں ایک بڑا تنورخانہ قائم کر دیا جائے۔ اس وقت غالب پر جو چراغ صبح کی مانند تھے کیا گزری ہوگی اس کا اندازہ ناممکن ہے۔ ایک دور ختم ہو گیا تھا اور دوسرا شروع ہوا تھا جو پہلے سے قطعی مختلف اور معاندانہ تھا۔ غالب نے ''دستنبو'' میں لکھا ہے:

''جن کو پھانسی دی گئی ہے ان کی تعداد فرشتۂ موت ہی جانتا ہے۔''

محض پھانسی ہی نہیں دی گئی بلکہ بعضوں کی کھال کھینچ لی گئی، بعض کو زندہ جلا دیا گیا۔ بعض کو توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ بعض کو قید میں سڑا دیا گیا۔ غرض انگریزوں کے انتقامی مظالم سے ''جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثار ہستی سراسر لٹ گئے۔''

غالب، بیگمات قلعہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''تم یہاں ہوتے اور بیگمات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی۔ کپڑے میلے۔ پائچے لیرلیر جوتیاں ٹوٹی۔''

اپنے متعلق لکھتے ہیں:

تو بے کسی و غریبی تراکہ می پرسد

''نہ جزا، نہ سزا، نہ نفریں، نہ آفریں، نہ عدل، نہ ظلم، نہ لطف، نہ قہر۔''

میر ابراہیم علی خاں سورتی کو لکھتے ہیں:

''خداوند نعمت کیا تم دلی کو آباد سمجھتے ہو.... کالے صاحب کا گھر اس طرح تباہ ہوا کہ جیسے جھاڑو پھیر دی ہو۔ کاغذ کا پرزہ، سونے کا تار۔ پشمینہ کا بال باقی نہیں رہا۔ شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا مقبرہ اجڑ گیا۔ ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی۔ اب ایک جنگل ہے اور میدان میں قبر۔''

دلی کی بربادی سے متعلق میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں:

''مسجد جامع سے راج گھاٹ تک بے مبالغہ ایک صحرائے لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں اگر اٹھ جائیں تو ہوکا مکان ہو جائے۔ واللہ دلی اب شہر نہیں، کیمپ ہے چھاؤنی ہے۔ نہ قلعہ نہ شہر، نہ بازار نہ نہر۔''

5/اکتوبر 1857 کو چند گورے غالب کے مکان میں گھس آئے اور ان کو گرفتار کر کے کرنل براؤن کے سامنے لے گئے اس وقت کسی مسلمان کو شہر میں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ کرنل براؤن نے پوچھا ''تم مسلمان ہو'' مرزا نے کہا۔ آدھا۔ فرمایا کیا مطلب؟ کہنے لگے شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔''

یہ گرفتاری اور باز پرس معمولی بات نہیں تھی۔ دلی کے احکام، قضا و قدر کے احکام تھے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور نقش جادہ نظر نہیں آتا تھا لیکن انھوں نے اس پل صراط پر بھی۔ ظرافت کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہمیں ظلمت کے برداشت کرنے کا اہل بنایا۔ اس شکست اور اضطراب کے زمانے میں جب موج خون ہمارے سر سے گزر رہی تھی۔ انھوں نے ہمیں ایک حوصلہ اور ہمت عطا کی۔ یہ فضا مادی ترقیوں کے لیے سازگار نہیں تھی۔ اب سرلشکری کا موقع نہیں تھا۔ صرف سخن گستری کا موقع تھا۔

غدر کے بعد غالب کے سارے ذرائع آمدنی مسدود ہو گئے تھے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ 53 برس کا پنشن۔ تقرر اس کا بہ تجویز لارڈ لیک و بہ منظوری گورنمنٹ۔ اور پھر نہ ملا ہے۔ نہ ملے گا۔ خیر احتمال ہے ملنے کا۔ علی کا بندہ ہوں۔ قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا۔ اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں بعد اس کے نہ کہیں قرض کی امید ہے نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل۔

غالب نے مجبور ہو کر انگریز حکام کو پنشن کی بازیابی کے لیے لکھا۔ قصیدے نظم کیے۔ عرضیاں بھیجیں اور 1860 میں جا کر پنشن کا کچھ روپیہ وصول بھی ہوا۔ رام پور کی سرکار نے بھی سو روپے ماہوار مقرر کر دیے تھے لیکن ان مواقع پر غالب کو خاصے خوشامدانہ خطوط لکھنے پڑے اور بندگی میں بھلا نہ ہوتا عبد اور معبود کے لیے شرمناک ہے۔

غدر کے بعد غالب ایک عرصے تک پنشن خلعت و خطاب اور دربار ولیبر کے قضیے میں گرفتار رہے۔ جب ان الجھنوں سے کچھ نجات ملی تو وہ عوارض فساد خون میں مبتلا ہو گئے اور پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہو گیا اور طاقت نے جواب دے دیا۔ وہ جون 1863 کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''1677 ہجری میں میرا نہ مرنا صرف میری تکذیب کے واسطے تھا مگر اس تین برس میں ہر روز مرگ نو کا مزا چکھتا رہا ہوں.... روح میری اب جسم میں اس طرح گھبرائی ہے جس طرح طائر قفس میں۔ کوئی شغل، کوئی اختلاط، کوئی جلسہ، کوئی مجمع، پسند نہیں۔ کتاب سے نفرت، شعر سے نفرت، جسم سے نفرت، روح سے نفرت، جو کچھ لکھا ہے بے مبالغہ اور بیان واقع ہے۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم''

آخری عمر میں مرزا غالب کو مالی دشواریوں اور مسلسل بیماریوں نے زندہ درگور کر دیا تھا لیکن اس حیوان ظریف کی بذلہ سنجی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مرنے سے ایک دن پہلے نواب علاء الدین لوہارو نے حال پوچھا تھا۔ انھیں جواب دیا۔ ''میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔

دم واپسیں بر سر راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے''

غالب نے کبھی مصائب کے آگے ہار نہیں مانی اور وہ ہر حال میں پر اُمید رہے۔ ان کی انسان دوستی، ان کی دردمندی، ان کی فراخ دلی، ان کی دیدہ وری، ان کی سنجیدہ ظرافت اور ان کی شگفتہ متانت ہماری تہذیب کا بہترین سرمایہ اور ان کی شخصیت ہماری ادب کی سب سے دل کش اور قد آور شخصیت ہے۔

□□□

محمد ہاشم قدوائی

ہماری مطبوعات

"جدید ہندوستان کے سیاسی وسماجی افکار" سے ماخوذ

ہند جدید میں علمی نشاۃ الثانیہ اور قوم پرستی کا آغاز

گذشتہ ڈیڑھ سو برسوں میں ایشیا کی سیاسی بیداری، روشن خیالی اور ترقی دنیا کی تاریخ کے اہم ترین باب ہیں۔ یہ سب براعظم صدیوں تک ہندوستانی، چینی اور بابلی کی سی عظیم تہذیبوں کا گہوارہ اور مرکز رہا۔ یہیں سے دنیا کے سارے اہم ترین مذہب یعنی بدھ مت، ہندومت، یہودیت، مسیحیت اور اسلام نکلے اور یہیں سے دنیا کی عظیم الشان سلطنتیں اور شہنشاہتیں ابھریں اور اس طرح سے ساری دنیا کو اس براعظم نے تہذیب اور تمدن کا سبق پڑھایا۔

سولھویں صدی سے یورپ کی مادی ترقی اور غلبے کا آغاز ہوا۔ اس لیے کہ یوروپین قومیں سائنس، صنعت وحرفت اور دوسرے علوم میں بہت زیادہ آگے بڑھ گئی تھیں۔ برعکس اس کے ایشیا میں مکمل علمی جمود طاری تھا۔ اس وجہ سے ایشیا ذہنی، علمی، مادی، سائنسی، غرض کہ ہر قسم کی ترقی کے میدان میں پیچھے رہ گیا۔

یوروپین قومیں سائنسی ایجادات اور فنی مہارت کی وجہ سے صنعتی پیداوار اور تجارت کے میدانوں میں بہت زیادہ آگے بڑھ گئیں۔ اور ساری تجارتی منڈیوں پر قابض ہو گئیں۔ اس میں سولھویں اور سترہویں صدی میں جارحانہ قوم پرستی کے آغاز نے بھی ان کی بڑی مدد کی اور بالآخر اٹھارویں صدی میں ہندوستان اور متعدد ایشیائی اور افریقی ممالک اپنی مادی پسماندگی کی وجہ سے یوروپین قوموں سے سامراج کا حصہ بن گئے۔

صنعتی انقلاب کی وجہ سے یوروپین ملکوں کی معاشی، صنعتی، تجارتی اور سیاسی قوت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور وہ بہت زیادہ خوش حال ہو گئے اور ایشیائی ممالک سیاسی اور معاشی اعتبار سے یوروپین ملکوں کے مفتوح اور دست نگر بن کر رہ گئے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیوں تک یہ ممالک معاشی انحطاط اور زوال، سیاسی مغلوبیت اور محکومیت، ان گنت سماجی خرابیوں اور تمدنی پسماندگی کا شکار رہے۔ ان میں صرف جاپان کی استثنائی مثال ملتی ہے جس نے انیسویں صدی کے نصف آخر سے ترقی کی دوڑ میں یوروپین قوموں کے دوش بدوش حصہ لینا شروع کیا اور بیسویں صدی کے اوائل میں ان سے یک گونہ سبقت لے گیا۔

ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا قیام جنوبی ہند میں 1840 سے لے کر 1763 کے مابین انگریزوں اور فرانسیسیوں کی باہمی اور مسلسل معرکہ آرائیوں میں انگریزوں کی کامیابی اور شمالی اور مشرقی ہند میں پلاسی اور بکسر کی فیصلہ کن جنگوں اور 1765 میں مغل شہنشاہ شاہ عالم کے انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیوانی حقوق عطا کرنے سلطنتِ مغلیہ کی کمزوری کی وجہ سے اور ہندوستانیوں کی نااتفاقیوں کی وجہ سے عمل میں آیا۔ اس کے قیام میں برطانوی ڈپلومیسی یا سیاست کاری، سیاسی داؤ پیچ، چال بازیوں اور جدید ترین اسلحات جنگ کے استعمال کو بہت زیادہ دخل تھا۔ برطانوی مقبوضات میں مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ کلایو، وارن ہسٹنگز، لارڈ ہسٹنگز اور ڈلہوزی ہندوستان میں برطانوی سامراج کے بانیوں میں تھے۔

انیسویں صدی کے وسط سے ایشیا میں سیاسی بیداری کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر سن یات سن جمال الدین افغانی، تلک، اروبندر گھوش، گوکھلے اور بیسویں صدی میں موہن داس کرم چند گاندھی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام، آزاد، کمال اتاترک، رضا شاہ اول، جواہر لال نہرو، سبھاش چندر بوس، چیانگ کائی شیک، اندرا گاندھی، جمال ناصر اور ماؤ وہ عظیم سیاسی رہنما ہیں جن کے سر اس کا سہرا بندھنا چاہیے اور اب ایشیائی ملکوں میں قوم پرستی کی جڑیں روز بروز مضبوط ہوتی جا رہی ہیں اور ان میں زبردست، دوررس اور مہتم بالشان سماجی، سیاسی اور معاشی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ نہ صرف پچھلا جمود ختم ہو رہا ہے بلکہ پرانا سماجی نظام ختم ہو رہا ہے اور یہ ممالک تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے ہیں ان میں زبردست صنعتی ترقی ہو رہی ہے ان کی پیداوار میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے ان میں تعلیم بہت زیادہ بڑھ رہی ہے۔ مفلسی اور مفلوک الحالی دور ہو رہی ہے۔ معیار زندگی اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ اب ایشیائی ممالک خود اپنی قسمتوں کے مالک ہیں۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندوستان میں نئے عہد کا آغاز کب سے ہوا۔ بعض

●گذشتہ دو صدیاں ہمارے ملک کی تاریخ میں بے حد ہنگامہ خیز رہی ہیں۔ اس کتاب میں ان تمام مفکرین، مصلحین، دانشوروں اور سیاسی رہنماؤں کے افکار ونظریات سے روشناس کرایا گیا ہے جن کی وجہ سے سیاسی، سماجی اور معاشی سطح پر انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ 494صفحات کی اس کتاب کی قیمت-/178روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

فاضلوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں نئے دور کا آغاز سولھویں صدی سے ہوا جب سے بھکتی تحریک شروع ہوئی اور اس نے روحانی اور سماجی مساوات کا سبق پڑھایا اور جب سے مغلوں نے آتشی اسلحات مثلاً توپ اور بندوق کا استعمال شروع کیا اور جب سے مغل شہنشاہوں نے ملک میں ایسا انتظامی ڈھانچہ قائم کیا جو کسی بھی حیثیت سے یوروپین ملکوں کے انتظامی ڈھانچے سے کم نہ تھا۔ ان شہنشاہوں نے مذہبی رواداری کے اصول پر عمل کیا اور ان کے عہد حکومت میں سارے شہریوں کی بلاتفریق وتخصیص و امتیاز مذہب وملت ورنگ وجنس پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ اسی زمانے میں یوروپین تاجر اور پادری بھی ہندوستان آنے لگے۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر سے ہندوستان یوروپین طاقتوں کے برتر اور بالاتر فوجی نظام سے آشنا ہوا اور مغربی عقلیت پسندی اور سائنسی اندازِ فکر سے روشناس ہوا اور مغربی علوم وفنون کی اشاعت شروع ہوئی اور اس کی وجہ سے زبردست ذہنی یا فکری بیداری پیدا ہوئی اور مذہبی، سماجی معاشی اور سیاسی مسئلوں پر سائنٹفک انداز سے غور کیا جانے لگا اور ان کو عقلیت پسندی کے نقطۂ نگاہ سے جانچا جانے لگا۔

جس طرح سے اطالوی نشاۃ الثانیہ یوروپین قوم پرستی کی ذہنی بنیاد یا اساس بنی ٹھیک اسی طرح سے ہندوستانی علمی نشاۃ الثانیہ بھی ہندوستانی قوم پرستی کی بنیاد بنی۔ ہندوستانی سماجی مصلحوں اور مذہبی رہنماؤں کی تعلیمات نے ہندوستانیوں میں قوم پرستی کے جذبے کو بیدار کیا اور اس کا گہرا اثر ہندوستانی فلسفے، مذہب تمدن اور سیاسی بیداری پر پڑا۔ اس باب میں ہندوستان پندرہویں اور سولھویں صدی کے یوروپ سے مماثلت رکھتا ہے۔ یوروپ میں بیکن، پارسلیس اور مائکلسن کی تحریروں اور تصنیفات کا گہرا اثر یوروپ کے ذہنی رجحانات، فلسفے، تمدن، مذہب اور سیاسی فکر پر پڑا۔ ان کی تحریروں اور تصنیفات نے یوروپ میں نیا جذبۂ عمل پیدا کیا اور وہ تمام تر تقدیر پر شاکر اور مجبور نہ رہے۔ ہندوستان میں علمی نشاۃ الثانیہ نے اخلاقی اور روحانی تصورات کو اور زیادہ تقویت پہنچائی اور یوروپین علمی نشاۃ الثانیہ کے برعکس اس نے بے لاگ ذہنی تحقیق پر زور دینے کے بجائے احیائے ماضی یا احیائے ہندویت یا روایتوں کے زندہ کرنے پر زور دیا۔ متعدد ہندو فاضلوں نے سارا زور اس پر دیا کہ ہندوستانی اپنی زندگی کو ویدوں، اپنشدوں، پرانوں اور بھگوت گیتا یعنی ہندو مذہبی کتابوں کی تعلیمات کے مطابق ڈھالیں۔

انھوں نے ہکسلے، ڈارون، ہربرٹ، جان اسٹوارٹ مل اور ہربرٹ اسپز کی روحانیت مخالف اور ہندوستانی قوم پرستی کی مخالف تحریروں اور تصنیفوں کی پرزور مذمت کی۔ احیائے ہندویت کا یہ جذبہ اس زبردست چیلنج کے خلاف بطور ردِعمل کے پیدا ہوا جو مغرب کی جارحانہ غیرملکی تہذیب کی طرف پیش کیا گیا تھا۔ یہ تہذیب مشرقی یا ہندوستانی تہذیب پر سیاسی اور مادی تفوق رکھتی تھی اس لیے کہ غیرملکی حکمراں اس تہذیب کے پیرو اور علمبردار تھے۔ یہ تہذیب خالصتاً میکانکی تھی اس میں اور ہندوستان کی خالص مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی تہذیب میں زبردست ٹکراؤ شروع ہوا اور اس کی وجہ سے نئے ہندوستان نے جنم لیا۔ پرانی ہندوستانی تہذیب دم توڑتے ہوئے معاشی نظام جو تمام تر جاگیردارانہ تھا کا مظہر تھی برعکس اس کے مغربی تہذیب کی بنیاد تجارتی سرمایہ دارانہ نظام پر تھی جس میں صنعت کار اور سرمایہ دار سیاسی اقتدار اور اختیار کے مالک تھے۔

غیرملکی سیاسی غلبے اور اقتدار کے خلاف ہندوستان کی پرانی تہذیب نبرد آزما ہوئی اور ہندو مذہبی کتابوں کی تعبیر اور تشریح ہندوستانی قوم پرست فاضل انسانیت دوستی کے نقطۂ نگاہ سے کرنے لگے انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان کتابوں کی تعلیمات کس درجہ آفاقی اور عالم گیر ہیں۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کرنا چاہا کہ یوروپ کی سائنسی تصورات کی بنیاد ان میں ملتی ہے چونکہ برطانوی سامراج نے ہندوستانی حکمرانوں کو شکستِ فاش دے دی تھی اس لیے اس کے سیاسی تفوق اور برتری کے خلاف ردِعمل کے طور پر روحانی اور مذہبی تسکین حاصل کرنے کی کوشش کی جانے لگی اور اس طرح سے اس زبردست صدمہ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی گئی۔

انیسویں صدی میں اس قسم کے ہندو دانشوروں نے تعلیم یافتہ ہندوؤں میں احیائے ہندویت کا زبردست جذبہ پیدا کیا اور اس کی وجہ سے جارحانہ ہندو قوم پرستی کو فروغ حاصل ہوا۔ بعض ہندو دانشوروں نے ہندو سماج کی سماجی اصلاح پر بہت زیادہ زور دیا اور ساتھ ہی ساتھ مذہبی اصلاح پر بھی انھوں نے تعلیم کے میدان میں بھی زبردست کام کیا۔ اس سلسلے میں رانا ڈے، مہاتما ہنس راج اور سوامی شردھانند کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ہنس راج کی قیادت میں شمالی ہندوستان کے بہت سے شہروں میں آریہ سماجیوں نے ڈی۔اے۔وی۔ اسکولوں اور کالجوں کا جال بچھایا۔ سوامی شردھانند نے ہند قدیم کے انداز پر ہردوار کے قریب گروکل کانگڑی قائم کی۔

یوروپین فاضلوں اور عالموں نے قدیم سنسکرت لٹریچر کا گہرا مطالعہ کیا۔ ولکنس اور ایچ۔ ایچ۔ ولسن نے اہم سنسکرت کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کر کے شہرت حاصل کی۔ میکس مولر، شوپن ہار اور دوسرے نامور یوروپین فاضل ہندو مذہبی مقدس کتابوں سے بہت زیادہ متاثر ہوئے خاص طور سے ان کے فلسفے سے یوروپین فاضلوں نے ہندوستانی نسلیات اور ہندوستانی علوم، آثار قدیمہ یا اثریات اور ہندو دیومالا کا بھی گہرا مطالعہ کیا اور ان فنون اور موضوعوں پر پُرمغز اور معرکۃ الآرا کتابیں تصنیف کیں۔ ان کتابوں کے مطالعے نے

ہندوستانیوں میں خود اعتمادی کا زبردست جذبہ پیدا کیا اور ہندو علما اور فضلا ان علوم کی طرف متوجہ ہوئے ان میں بھنڈارکر اور بال گنگادھر تلک کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

1875 میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا خاص مقصد ہندو فلسفے کا مطالعہ اور اس کی تشریح اور اشاعت کرنا تھی۔ اس سوسائٹی کے بانیوں میں میڈم بلاوٹسکی اور ہنری الکاٹ تھے۔ اس سوسائٹی سے جو فاضل خاص طور سے متاثر ہوئے انھوں نے سائنٹفک انداز میں ہندو یوگ کے اصولوں کی تشریح اور تعبیر کی۔ ان میں مسز اینی بسنٹ سب سے زیادہ نمایاں تھیں۔ وہ پرانوں کے فلسفے سے بہت زیادہ متاثر تھیں۔ وہ ہندومت کی پوری طرح سے قائل تھیں۔ 1913 سے انھوں نے ہندوستانی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا اور ان کا شمار کانگریس کے چوٹی کے لیڈروں میں ہونے لگا۔

ہندومت کی حمایت اور دفاع کے لیے نامور ہندو دانشور سوامی وویکانند نے زبردست تحریک شروع کی۔ وہ سوامی رام کرشن کے چیلے تھے۔ سوامی رام کرشن نے بنگال میں روحانی اور اخلاقی تعمیر کے لیے بہت کام کیا تھا۔ سوامی وویکانند اعلیٰ پائے کے مقرر تھے۔ وہ ویدانت اور یوروپین دونوں فلسفوں کے زبردست فاضل تھے۔ انھوں نے 1893 میں شکاگو میں منعقدہ عالمی مذہبی پارلیمنٹ میں شرکت کر کے ہندومت کو ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور ایک حد تک یورپ کے ملکوں میں روشناس کرایا۔ انھوں نے رام کرشن مشن کی زبردست تنظیم کی۔ مذہبی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ وہ قوم پرست تھے۔ وہ ہندوستانیوں میں خود اعتمادی اور بے خوفی کا جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔

جنوبی ہند میں ہندوستانی نشاۃ الثانیہ بہت بڑی حد تک روحانی اور مذہبی رنگ میں رچی ہوئی تھی۔ تھیوسوفیکل سوسائٹی کا مستقر مدراس تھا اسی کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری بھی شروع ہوئی۔ اس کے پھیلانے میں ویرار گھوچاریہ، سناراؤ، چِلو اور بی سبرا مینا آئر پیش پیش تھے برعکس اس کے مغربی ہند یعنی مہاراشٹر میں نشاۃ الثانیہ کا رنگ زیادہ تر سماجی اور تعلیمی رہا۔

ہندوستان میں برطانوی شہنشاہیت کے قیام کے ساتھ ساتھ مسیحیت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے خاتمے کے بعد بھی اس کو فروغ ہوتا رہا لیکن مسیحی مشنریوں کو مہاراشٹر میں قابل ذکر کامیابی حاصل نہ ہو سکی اس لیے کہ مہاراشٹر کٹر قسم کا ہندو تھا۔

انیسویں صدی کی تیسری دہائی سے انگریزی یا مغربی تعلیم کو ہندوستان میں فروغ ہوتا گیا۔ انگریزی حکومت کی تعلیمی پالیسی کی بنیاد لارڈ میکالے نے ڈالی تھی۔ اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کی ایسی نسل پیدا کی جائے جو سرکاری دفتروں میں کلرک کی جگہوں پر کام کرے اور انگریزی یا مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید کرے۔ اعلیٰ تعلیم کی اشاعت اور ترویج کے لیے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ مغربی تعلیم کے اثر سے ہندوستان میں جدید ذہنی اور سیاسی زندگی کا آغاز ہوا اور بڑی جلیل القدر ہستیاں یہ تعلیم پاکر نکلیں جنھوں نے سیاست، ادب، تعلیم، صحافت، شاعری، سماجی اصلاح، علمی تحقیق، سائنس، مذہب یا مذہبی اصلاح، معاشیات تاریخ اور فلسفے میں شہرت حاصل کی۔ ان میں دادا بھائی نوروجی، بھنڈارکر، بدرالدین طیب جی، جسٹس سید محمود، فیروز شاہ مہتہ، رانا ڈے، رمیش چندر دت، جسٹس امیر علی، بال گنگادھر تلک، گوپال کرشن گوکھلے، سریندر ناتھ بنرجی، رابندر ناتھ ٹیگور، سوامی وویکانند، جگدیش چندر بوس، پی۔سی۔رے اور نیلاٹنگ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مہاراشٹر کی سماجی اور ذہنی بے چینی نے نئی انجمنوں اور سوسائٹیوں کو جنم دیا۔ رانا ڈے نے ستیہ سودھک سماج کی بنیاد ڈالی جس کا خاص مقصد مرہٹوں میں سماجی اصلاح کرنا تھی۔ 1867 میں بمبئی میں کیشپ چندر سین نے پرارتھنا سماج قائم کی۔ رانا ڈے اور چندر داکر اس کے خاص رہنماؤں میں تھے یہ انجمن خالص سماجی اصلاح کے لیے قائم کی گئی تھی اسے مذہبی مسئلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے بیوہ عورتوں کی شادی، مختلف ذاتوں میں شادی بیاہ کرنے اور ساتھ کھانا کھانے پر زور دیا۔

بھنڈارکر نے سنسکرت کے زبردست عالم اور نامور فاضل کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل کی انھیں بھی سماجی اصلاح سے بہت زیادہ دلچسپی تھی لیکن مہاراشٹر میں سماجی اصلاح اور تجدید کی تحریک کی علمبرداری مہادیو گووند رانا ڈے کے حصے میں آئی۔ انھوں نے سماجی کانفرنس قائم کی جس کے سالانہ جلسے کانگریس کے سالانہ جلسوں کے ساتھ کئی سال ہوتے رہے۔ اس کانفرنس کی وجہ سے سماجی اصلاح کی تحریک کو بہت زیادہ تقویت پہنچی۔

سرواجنک سبھا مہاراشٹر کی سب سے اہم سیاسی جماعت تھی۔ 1872 میں اس نے اپنے نمائندے کو لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا جو ہندوستانی مسئلوں کے بارے میں پارلیمینٹری کمیٹی سے گفت وشنید کرے گو اس فیصلے کو عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔ 79-1878 کے زبردست قحط میں اس نے قحط کے مارے ہوئے مصیبت زدوں کی زبردست مدد کی۔ 1905 کی ہندوستان گیر سودیشی تحریک کے شروع ہونے سے بہت پہلے یہ مہاراشٹر میں سودیشی چیزوں کے استعمال کی تحریک شروع کر چکی تھی۔ وشنو کرشن چپلونکر اور بنکم چندر چٹرجی نے اپنی تحریروں اور تصنیفوں کے ذریعے ہندو قوم پرستی کو بہت زیادہ تقویت پہنچائی۔ چٹرجی بنگال میں علمی نشاۃ الثانیہ کے علم بردار تھے۔ 1882 میں

انھوں نے اپنا مشہور ناول آنند مٹھ تصنیف کیا جو 5-1772 کی سیاسی بغاوت کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ انھوں نے ہندو بنگالیوں میں جارحانہ ہندو قوم پرستی کا جذبہ پیدا کیا۔

وشنو کرشن چپلونکر مراٹھی کے نامور ادیب تھے انھیں مراٹھی زبان اور ادب کا شواجی کہا جاتا ہے انھوں نے مہادیو گووند راناڈے اور سوامی دیانند کی تحریکوں کی بڑی شدومد سے مخالفت کی۔ وہ انگریزی تعلیم کے لیے اس لیے زبردست حامی تھے کہ ان کے نزدیک مغربی یا انگریزی تعلیم شیرنی کے دودھ کے مانند تھی کیونکہ اس سے قومی تومندی اور آزادی کے جذبے پیدا ہوئے تھے لیکن وہ مغرب کی اندھی تقلید کے شدید مخالف تھے۔ وہ مہاراشٹر کی قدیم روایتوں، اداروں اور ثقافت کے زبردست حامی تھے۔ 1880 میں انھوں نے تلک کے ساتھ ایک نیو انگلش اسکول قائم کیا اور اس کے ہیڈ ماسٹر بھی ہو گئے۔ وہ عوام میں تعلیم پھیلانا چاہتے تھے اس کے لیے انھوں نے کیسری اور مرہٹہ اخباروں کے نکالنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ان دونوں اخباروں کی اشاعت کے لیے آریہ بھوشن پریس کے نام سے ایک پریس کھولا۔

ہندی زبان اور ادب کا ہندو قوم پرستی کو فروغ دینے میں بہت بڑا ہاتھ رہا۔ اس سلسلے میں للو لال ساگر، راجہ شوپرشاد اور سوامی دیانند کی تصانیف خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مقبولیت سوامی دیانند کی کتاب ستیارتھ پرکاش کو حاصل ہوئی۔ اس کے ذریعے انھوں نے آریہ سماجی تحریک کے بنیادی اصول پیش کیے۔

برطانوی حکومت نے ہندوستان میں مغربی سیاسی ادارے قائم کیے ان میں گورنر جنرل اور گورنروں کی ایگزیکٹو کونسلیں، گورنر جنرل کی کونسل کے ممبر قانون، قانونی کمیشن اور سپریم کونسل قابل ذکر ہیں۔ ان اداروں کے قیام سے بھی ہندوستانی قوم پرستی کو تقویت پہنچی۔

انیسویں صدی کے اواخر میں انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے ہندوستانی قوم پرستوں نے یہ مطالبہ پیش کرنا شروع کیا کہ ہندوستانیوں کو اہم سرکاری ملازمتیں دی جائیں۔ اپنے اس مطالبے کی تائید میں انھوں نے 1833 کے چارٹر ایکٹ کو پیش کیا جس میں یہ صاف طور سے کہا گیا تھا کہ ساری نوکریاں اور عہدے بلا تخصیص و امتیاز و تفریق مذہب ورنگ وملت، جنس و ذات ہندوستانیوں کو حاصل ہوں گی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے ملکہ وکٹوریہ کے 1858 کے اس تاریخی اعلان کو بھی پیش کیا جس میں غیر مبہم لفظوں میں اس کا اعلان کیا گیا تھا کہ برطانوی رعایا کے جملہ افراد قانون کے روبرو مساوی ہیں اور سرکاری ملازمتیں قابلیت کی بنا پر ہندوستانیوں کو ملا کریں گی اور اس بارے میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہ برتا جائے گا لیکن لارڈ ولٹن اور لارڈ کرزن کی جابرانہ مستبد اور ہندوستانی مخالف پالیسیوں نے رنگ اور نسل کی بنیاد پر ہندوستانیوں سے امتیازی سلوک کرنا شروع کر دیا، اس لیے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں کے اوائل میں کانگریس کی طرف سے ہندوستان میں نیابتی اداروں کے قائم کیے جانے کا مطالبہ پیش کیا جانے لگا تاکہ ہندوستانیوں کی آواز برطانوی حکومت تک ان کے چنے ہوئے نمائندوں کے ذریعے پہنچے۔ راجہ رام موہن رائے، دادا بھائی نوروجی، سریندر ناتھ بنرجی، گوپال کرشن گوکھلے کے سیاسی نظریے بڑی حد تک برطانوی سیاسی نظریوں کا چربہ تھے اور یہ لوگ برطانوی سیاسی اداروں کے بہت زیادہ قائل تھے۔

1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ہندوستان قوم پرستی اور ہندوستان کی آزادی کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے۔ اس کے قائم کرنے کا خاص مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کی ایک ایسی سیاسی نمائندہ جماعت قائم کی جائے جو ملک کے حکومتی انتظام اور سیاسی معاملوں کے بارے میں ہندوستانیوں کے خیالات اور خواہشات حکومت کے سامنے پیش کرے۔ اپنے قیام کے ابتدائی دور میں کانگریس محض ایک بحث ومباحثہ کرنے والی جماعت تھی اس کے جلسوں میں جو تقریریں ہوتی تھیں وہ اس زمانے کے برطانوی لبرل رہنماؤں کی تقریروں کے انداز میں کی جاتی تھیں اور انھی کے خیالات کا چربہ ہوتی تھیں۔

لیکن 1905 سے 1907 کی مدت میں کانگریس کا رنگ بالکل بدل گیا اب یہ محض اس کا مطالبہ نہیں پیش کرتی تھی کہ سرکاری ملازمتیں ہندوستانیوں کو دی جائیں یا ان کی فلاں فلاں شکایتیں دور کی جائیں بلکہ یہ سوراج یا حکومت خود اختیاری کی طلب گار تھی۔ اس کے اندر ایک انتہا پسند بازو بھی ابھرا جس نے تلک، بپن چندر پال، اروبند گھوش اور لالہ لاجپت رائے کی قیادت میں کانگریس کا اعتدال پسند اور برسر اقتدار جماعت کی پالیسیوں سے شدید اختلاف ظاہر کیا اور انھی اختلافات کی وجہ سے 1907 میں کانگریس سے علاحدگی اختیار کی۔ 1915 تک کانگریس کا اقتدار اعتدال پسند جماعت ہی کے ہاتھوں میں رہا۔ 1916 میں کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں یہ دونوں جماعتیں متحد ہو گئیں اور کانگریس پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط اور بااثر جماعت بن گئی۔ 1919 میں اس کے سب سے بااثر اور مقبول ترین لیڈر گاندھی جی ہو گئے اور اسی سال سے نہ صرف کانگریس بلکہ ہندوستانی سیاسیات میں گاندھی عہد کا آغاز ہوا اور یہ جماعت پورے طور سے عوامی سیاسی جماعت بن گئی۔

سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی میں انگریزی، فرانسیسی اور ڈچ تجارتی کمپنیوں نے ہندوستان سے تجارت شروع کی اور اس کے ساتھ ساتھ

یوروپین سرمایہ دارانہ نظام کا بھی آغاز ہوا۔ ایک حد تک انگلستان میں صنعتی انقلاب کو بنگال کی معاشی لوٹ کھسوٹ اور انگریزوں کے معاشی غلبے کی وجہ سے فروغ حاصل ہوا اور ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے گماشتے مرشد آباد، ڈھاکہ اور بنگال کے دوسرے شہروں میں ہندوستان کی مایہ ناز صنعت پارچہ بانی کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوئے۔ برطانوی تجارتی سرمایہ داری کو فروغ ہوا اور اسی وجہ سے ہندوستانی معاشی نظام بالکل تہہ و بالا ہو کر رہ گیا۔ نئے شہروں کے معرض وجود میں آنے اور پرانے شہروں کی آبادی بڑھ جانے کے باعث ملک میں بالکل نیا اور تنقید کرنے والا انفرادی ذہن پیدا ہوا جو ہر چیز کو معاشی نفع اور نقصان کے معیار سے ناپنے لگا۔ بمبئی، مدراس اور کلکتہ جدید تجارت، صنعت وحرفت اور کاروبار کے اہم ترین مرکز ہو گئے۔ ہندوستانی قوم پرستی کو ایک نئے معاشی طبقے سے بہت زیادہ مدد ملی۔ مغل عہد حکومت میں ہندوستان کے معاشی نظام کی بنیاد جاگیردارانہ نظام پر تھی۔ جاگیردار، تعلقہ دار، زمیندار اور بڑے بڑے رئیس اقتدار کے مالک تھے لیکن برطانوی حکومت کی بدولت اب ہندوستان میں ایسا معاشی نظام قائم ہوا کہ جس کی بنیاد سرمایہ دارانہ نظام پر تھی اس کی وجہ سے صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کا طبقہ معرض وجود میں آیا۔ یہ زیادہ منافع کمانے کی وجہ سے روز بروز زیادہ دولت مند ہونے لگا اس نئے طبقے نے قوم پرست اور جدید اصلاحی تحریکوں کی دل کھول کر مدد کی۔ بیسویں صدی میں اس نظام کو اور زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ تجارت، سٹہ بازی، بنک کاری، صنعت وحرفت، کارخانوں، فیکٹریوں اور ملوں کے ذریعے ملک کی دولت میں اضافہ ہوا اور یہ ملک کی سماجی اور سیاسی تحریکوں کی ترقی کی مادّی بنیادیں بنیں۔

برطانوی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کا ہندوستان کے سماجی حالات پر زبردست اثر پڑا۔ اب قانون بنانے والی جماعتوں نے بتدریج ایسے قانون پاس کیے کہ جن سے ہندو عورتوں کی سماجی پوزیشن پہلے سے زیادہ بہتر ہوئی۔ شادی بیاہ کے رسوم اور رواج میں مفید اصلاحیں کی گئیں۔ کیشپ چندر سین، سوامی دیانند سرسوتی، مہادیو گووند راناڈے، مالا باری اور تیلانگ جیسے سماجی مصلحوں نے ان اصلاحوں کا مطالبہ کیا۔ ان سماجی اصلاحوں کے بارے میں برطانوی حکومت کا رویہ عدم مخالفت کا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کے رسم و رواج میں مداخلت کرنا ناپسند کرتی تھی اور نہ وہ ملک کا سماجی نظام بدلنا چاہتی تھی اس لیے کہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں سماجی اصلاح آگے چل کر سیاسی رنگ نہ اختیار کرے جو بالآخر اس کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائے۔ اس عدم مداخلت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ برطانوی حکومت اپنا سیاسی غلبہ ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہتی تھی اور زیادہ سے زیادہ معاشی فائدے حاصل کرنا چاہتی تھی۔

ہندوستان کے دانشور جنھوں نے ہند جدید کی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا مغربی سیاسی فلسفے سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ میزنی کی تعلیمات اور نظریات کا انھوں نے گہرا اثر قبول کیا۔ ان میں انتہا پسند اور اعتدال پسند دونوں شامل تھے۔ سریندر ناتھ بنرجی، لالہ لاجپت رائے اور وی. ڈی. ساورکر نے اس اطالوی رہنما کے حالات زندگی انگریزی، اردو اور مرہٹی زبان میں لکھے۔ برک، گلیڈسٹن، کائیڈن، جان برائٹ، جان اسٹوارٹ مل، ہربرٹ اسپنسر کے سیاسی نظریوں سے، ہندوستانی سیاسی نظریوں سے ہندوستانی سیاسی رہنماؤں نے بہت زیادہ خوشہ چینی کی۔ گاندھی جی، ٹالسٹائے، رسکن اور تھورو سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، برگسان، ہیگل اور نیٹشے کے فلسفے نے اربندو گھوش اور اقبال کو متاثر کیا۔ 1920 کے بعد سے کارل مارکس لینن، اسٹالن، مسولینی اور ہٹلر نے ہندوستانی کمیونسٹوں، سوشلسٹوں اور دوسرے انقلابیوں کو متاثر کیا اس طرح سے فرانسیسی، امریکن اور روسی انقلاب کے نظریوں نے بھی ہندوستانی مفکروں کو خاصا متاثر کیا۔

لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ہندوستانی سیاسی فکر تمام تر یوروپین سیاسی فکر سے متاثر ہے۔ ہندوستانی قوم ہیروؤں اور ہندوستانی تاریخ نے بھی ہندوستانی مفکرین پر گہرا اثر ڈالا یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی قوم پرستی میں ایک حد تک احیائے ہندوئیت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ جہاں ایک طرف برطانوی لبرل ازم نے کانگریس کے بانیوں کو متاثر کیا تو دوسری طرف ہندو تحریکوں اور تصنیفوں نے بھی۔ تیسری طرف مسلم علما جن میں دیوبند کے علما اور مولانا سید احمد شہید کے معتقدین خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے 1857 تک مسلسل برطانوی سامراجی حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد جاری رکھی اور ان میں سے بعضوں پر 1857 کے بعد بھی سازش کے مقدمے چلائے گئے۔ علما کا یہ انقلابی گروہ ہندوستان کی قومی تحریک پر خاص اثر انداز ہوا۔ مولانا قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی قیادت میں علما برطانوی حکومت کے مخالف رہے اور مولانا رشید احمد گنگوہی اور بہت سے عالموں نے کانگریس کی حمایت میں 1888 میں فتویٰ دیا اور چوتھی طرف سید احمد خاں کی قیادت میں علی گڑھ اسکول نے مسلمانوں میں زبردست علمی اور ذہنی انقلاب پیدا کیا اور مسلم سماج کے بعض طبقے بڑی حد تک اس تحریک کے اثر کی وجہ سے مغربیت سے متاثر ہوئے اور ان میں تجدد کا آغاز ہوا۔ یہ اسکول سماجی اور مذہبی اصلاح کا علمبردار تھا لیکن سیاسیات میں یہ برطانوی حکومت کا وفادار تھا اور کانگریس اور ہندوستانی قوم پرستی کا مخالف۔

□□□

اے.پی.ڈی.سلام

کیریئر گائیڈنس کالم

فارمیکوگنوسی میں کیریئر

لفظ فارمیکوگنوسی دو یونانی الفاظ Pharma kon (ڈرگ) اور gnosis (جانکاری) سے لیا گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں دواؤں (مفرد دوا) کی جانکاری۔ فارمیسی (دواسازی/عطاری) کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس کا تعلق جانوروں، سبزیوں، معدنیات سے حاصل ہونے والی خام ادویات کی شناخت طبعی، کیمیاوی اور حیاتی خصوصیات بشمول ان کی تاریخ، کاشت، انھیں اکٹھا کرنے اور ان کی نگہداشت و استعمال سے ہے۔

فارمیکوگنوسٹ کا خاص کام خام دواؤں کی شناخت، ان کے بالکل صحیح ہونے کی تصدیق کرنے اور ان میں ملاوٹ کا پتہ لگانے اور ان کے متبادل تجویز کرنا ہے۔ وہ اس دوطرز کے متبادل پودوں سے سرگرم افراد/خام دوا کا مطالعہ اور ان کے کیمیاوی ردعمل کی چھان بین کرتا ہے۔ علاوہ ازیں ان پودوں کے کاروباری استعمال کے لیے کاشت کے مناسب طریقے بھی تجویز کرتا ہے۔

اگرچہ فارمیکوگنوسی کی اصطلاح جدید ہے لیکن ادویاتی پودوں اور ان کے استعمال کی جانکاری بنی نوع انسان کی تاریخ کے آغاز سے ہے۔ قدیم عہد میں بھی اس علم کو کافی مقبولیت حاصل تھی کیونکہ اس دور میں پودوں یا پودوں کے مخصوص حصوں کو انسانی بیماریوں/معذوری کے علاج کے لیے کام میں لایا جاتا تھا۔ کئی جڑی بوٹیوں کے پتے، چھال اور جڑیں کامیابی کے ساتھ بیماریوں کے علاج میں کام میں لائی جاتی تھیں۔ چنانچہ ان کا استعمال ایک مرتبہ شروع ہونے کے بعد نسل درنسل جاری رہا۔

آج کل لوگوں کا رجحان عام طور پر دیسی ادویات اور طریقۂ علاج کی طرف زیادہ ہے۔ یہ طریقۂ علاج بالکل جامع ہوتا ہے۔ اس میں نہ صرف بیماری کا علاج کیا جاتا ہے بلکہ آئندہ اس طرح کی بیماری سے مدافعت کی طاقت بھی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

روایتی طریقۂ علاج کی روزافزوں مقبولیت سے اس شعبے میں پیشہ وروں کی مانگ میں اضافہ ہونا بھی قدرتی ہے۔ ہندوستانی طریقۂ علاج کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے باقاعدہ تعلیم وتربیت لازمی ہے۔ اس کے علاوہ کئی طرح کے ہندوستانی طریقہ ہائے علاج میں پوسٹ گریجویٹ سطح پر فارمیکوگنوسی کو بطور خصوصی مضمون پڑھایا جاتا ہے۔ مثلاً ایم ڈی (آیوروید) میں دردیاگنا (فارمیکوگنوسی) ایک خصوصی مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے اور اس شعبے میں باقاعدہ تحقیق کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔ ہندوستانی طریقۂ علاج میں بھی فارمیکوگنوسی کو بطور کیریئر اختیار کیا جاسکتا ہے۔ خواہش مند امیدوار اس سلسلے میں ضروری جانکاری ویب سائٹ www.indinamedi cine-nic.in سے حاصل کرسکتے ہیں۔

فارمیکوگنوسی کے شعبے میں کامیاب کیریئر کے لیے فارمیکوگنوسی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری یا فارمیکوگنوسی میں خصوصی مہارت کے ساتھ ایم فارم لازمی ہے۔ فارمیکوگنوسی میں کیریئر کے لیے فارمیسی میں بی فارم ڈگری کم سے کم اہلیت ہے۔ طلبہ اس شعبے میں ڈپلوما (فارمیسی) کرکے بھی داخل ہوسکتے ہیں۔ کیونکہ یہ فارمیسی کا مساوی کورس ہے۔ ڈی فارم کرنے کے بعد بی کام کورس میں لیٹرل داخلہ بھی ممکن ہے۔

اس وقت ملک بھر میں تقریباً 150 اداروں میں فارمیسی کورس کرائے جارہے ہیں۔ ان میں بیشتر کورس عام طور پر انڈر گریجویٹ سطح کے ہیں۔ ان میں سے کئی اداروں میں پوسٹ گریجویٹ سطح پر بھی کورس کرائے جاتے ہیں۔ آپ علم طبعیات، علم کیمیا اور علم حیات یا ریاضی کے ساتھ 10+2 کرنے کے بعد فارمیسی کورس کرسکتے ہیں۔ یہ ڈی فارم (2 سالہ کورس) یا بی فارم (4 سالہ کورس) ہوسکتے ہیں۔ ان کورسوں میں داخلہ ریاستی یا مرکزی حکومت کے زیر اہتمام مقابلہ جاتی داخلہ امتحان کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔

اگرچہ ڈی فارم اور بی فارم سطح پر بھی فارمیکوگنوسی کا مضمون پڑھایا جاتا ہے لیکن یہ بنیادی نوعیت کا ہوتا ہے لیکن اس مضمون میں خصوصی مہارت حاصل کرنے کے لیے آپ کو ایم فارم (2 سالہ کورس اور اس کے بعد ڈاکٹورل/پوسٹ ڈاکٹورل کورس کرنا ہوگا۔ ایم فارم میں تقریباً 8 طرح کے خصوصی مہارت کے شعبہ جات ہیں۔

فارمیکوگنوسی ان میں سے ایک ہے۔ ہندوستان میں فارمیسی/فارمیسوٹیکل کورس سے متعلق کئی اداروں میں فارمیکوگنوسی کے علاحدہ شعبے ہوتے ہیں جہاں تجربہ گاہ (لیبارٹری) کی سہولیات بھی دستیاب ہوتی ہے۔ ہندوستان میں فارمیسی/فارمیکوگنوسی کے کورس کرانے والی یونیورسٹیوں اور اداروں میں سے چند درج ذیل ہیں:

الامین کالج آف فارمیسی، منگلور۔

برلا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی، رانچی۔

ممبئی کالج آف فارمیسی، ممبئی۔
بی.وی.پٹیل فارمیسوٹیکل ایجوکیشن اینڈ ریسرچ ڈولپمنٹ سینٹر احمد آباد۔
چنئی میڈیکل کالج، چنئی۔
چیرن کالج آف فارمیسی کوئمبتور، ڈیپارٹمنٹ آف فارمیسوٹیکل سائنسز۔
ڈاکٹر ایچ ایس گوڑ وشو ودیالیہ، ساگر (ایم. پی.)۔
ڈیپارٹمنٹ آف فارمیسوٹیکل ٹیکنالوجی جادو پور یونیورسٹی، کولکاتہ۔
گورنمنٹ کالج آف فارمیسی بنگلور۔
ہیم چندر آچاریہ نارتھ گجرات یونیورسٹی، پٹن، گجرات۔
فیکلٹی آف فارمیسی جامعہ ہمدرد نئی دہلی۔
کے.ایل.ای.سوسائٹیز کالج آف فارمیسی ہبلی۔
ایم.اے.ای.آر.مہاراشٹر انسٹی ٹیوٹ آف فارمیسی، پونہ۔
مہاتما گاندھی کالج آف فارمیسوٹیکل سائنسز جے پور۔
نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف فرمیسوٹیکل ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (این.آئی.پی.ای.آر.) موہالی پنجاب۔
پونہ کالج آف فارمیسی، علی گڑھ کالج آف فارمیسی پونے۔
یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ آف فارمیسوٹیکل ٹیکنالوجی، اناملائی یونیورسٹی انا ملائی نگر یونیورسٹی۔
انسٹی ٹیوٹ آف فارمیسوٹیکل سائنسز، پنجاب یونیورسٹی۔
چنڈی گڑھ یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ آف فارمیسوٹیکل سائنسز، ممبئی۔
دشویسریا پور انسٹی ٹیوٹ آف فارمیسوٹیکل سائنسز، بنگلور وغیرہ۔

یہ فہرست مکمل نہیں ہے اس سلسلے میں مزید تفصیلات کے لیے ویب سائٹ www.medicoinfoline.com ملاحظہ کریں۔

بی.کام کرنے پر آپ فارمیسی، فارمیسوٹیکل کیریئر اختیار کر سکتے ہیں لیکن تدریس/تحقیق کا کیریئر اختیار کرنے کے لیے آپ کا ایم فارم اور/یا ڈاکٹریٹ ڈگری یافتہ ہونا ضروری ہے۔ فارمیسی/فارمیکوگنوسی کے پیشہ وروں کے لیے اسپتالوں فارمیسوٹیکل صنعتوں، تدریسی/تحقیقی امیدواروں میں ان کی تعلیمی لیاقت اور تجربے کے لحاظ سے روزگار کے مواقع دستیاب ہو سکتے ہیں۔ان میں اسپتالوں اور میڈیکل اسٹور میں فارمیسسٹ، فارمیسوٹیکل کمپنیوں میں سیلز/میڈیکل نمائندے، بایوکیمیکل اور پیتھالوجیکل لیباریٹریوں میں ٹیکنیشین، کیمیکل/ڈرگ انالسس لیباریٹریوں میں انالسٹ، ڈرگ انسپکٹر اور تدریسی اداروں میں انسٹرکٹر، ڈیمانسٹریٹر، لیکچرر، ریڈر یا پروفیسر اور تحقیقی اداروں میں سائنٹسٹ کی حیثیت سے روزگار کے مواقع موجود ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں بھی فارمیکوگنوسی کے شعبے میں روزگار کے مواقع دستیاب ہونے کے امکانات روشن ہیں۔

مصنف: بوٹینکل سروے آف انڈیا،ہوڑہ کے فارمیکوگنوسی یونٹ میں سائنس داں ھیں۔

(بشکریہ ''روزگار سماچار'' 26 نومبر تا 2 دسمبر 2005، نئی دہلی)

□□□

کلیات محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: سیّدہ جعفر

گولکنڈے کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بنیاد گزار قلی قطب شاہ فنونِ لطیفہ کا قدر شناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیّدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈے کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

صفحات: 823، قیمت: -/175 روپے

کلیاتِ سراج

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش و کوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے.پورم، نئی دہلی-110066

پنیت تیر، استوتی تریکھان، سمرات شرما "C ایڈونچر" سے اقتباس

فنکشن اور اس کے مواقع

عام لفظوں میں فنکشن اسٹیٹمنٹس کے ایسے مجموعے کا نام ہے جو ایک مخصوص کام انجام دیتا ہے۔ فنکشن اختیاری طور پر ایسے ڈیٹا کو سرانجام دیتا ہے جو کچھ پیرامیٹرس کے ذریعے اس میں گزرتے اور نتیجے میں کوئی ویلیو دیتے ہیں۔ آپ کا C کی کچھ فنکشنوں سے واسطہ پڑ چکا ہے جیسے ()main، اور اسٹینڈرڈ لائبریری فنکشن ()printf اور ()scanf۔ C پروگرام میں آپ اپنے فنکشن بنا کر استعمال کر سکتے ہیں۔

ایک پروگرام میں فنکشن کے استعمال کی دلیل یہ ہے کہ وہ کوڈ جو پروگرام میں بار بار دہرایا جاتا ہے اسے فنکشن بنایا جا سکتا ہے اور کوڈ کو دہرانے کے بجائے اس فنکشن کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

7.1 خود اپنا فنکشن لکھنا

فنکشن کی عام شکل اس طرح ہوگی۔

```
return_type  function_name(parameters)
{
      /*Statements */
}
```

ایک فنکشن میں پانچ حصے ہوتے ہیں:

1. فنکشن کو ڈیٹا ٹائپ کے ذریعے سے ڈکلیئر کرنا پڑتا ہے جس کا دارومدار return value پر ہے۔ فنکشن ایک ویلیو واپس کر سکتا ہے اور ویلیو کے ڈیٹا ٹائپ کا موازنہ فنکشن کے ڈیٹا ٹائپ سے کیا جاتا ہے۔ اگر فنکشن کوئی ویلیو واپس نہ دے تو Void ہو جائے گی مگر اسے دیا گیا کام ایگزیکیوٹ ہوگا۔
2. ایک فنکشن کو ایک نام ضرور دیا جانا چاہیے اور اس کو نام دیے جانے کا طریقہ بھی وہی ہے جو ویریبل کو دیے جانے کا تھا۔ جب اس کا نام دیا جائے تو وضاحت ضروری ہے کہ فنکشن کا کام کیا ہوگا۔ add intigers یا height average ناموں کی مثالیں ہیں جنھیں آپ استعمال کر سکتے ہیں۔

```
int squareNumber (int x)
{
int itsSquare;
itsSquare = x * x;
return itsSquare;
}
```

3. ایک یا ایک سے زائد پیرا میٹرز کو ایک بریکٹ کے اندر ڈکلیئر کر سکتے ہیں۔ یہ لوکل ویریبلز جنھیں قومہ لگا کر الگ کیا جاتا ہے۔ انھیں لوکل ویریبلز اس لیے کہتے ہیں چونکہ فنکشن کے خاتمے پر ویریبلز کو دی گئی میموری بھی ختم ہو جاتی ہے۔ جب آپ کو فنکشن کی ضرورت نہیں ہوگی تو آپ بریکٹ میں کچھ نہیں رکھیں گے۔
4. بریکٹ کے درمیان موجود content کو فنکشن باڈی کہتے ہیں۔
5. فنکشن باڈی میں ایک یا ایک سے زائد Return Statement اسٹیٹمنٹ ہوتے ہیں جب تک کہ آپ فنکشن کو بطور "Void" نہ واضح کر دیں۔ ویلیو کی واپسی کے لیے ریٹرن کی ورڈ کا استعمال کریں۔

فنکشن کی تعریف کے لیے یہ ایک دوسرا طریقہ ہے:

```
int addintegers(int a,int b)
{
int c = a + b;
return c;
}
```

فنکشن کی تعریف اور اس کی وضاحت کے درمیان فرق جاننے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ جب کہ فنکشن کی وضاحت درج ذیل چیزوں سے کی جا سکتی ہے۔

```
return_type  function_name(parameters)
```

ڈکلیریشن کمپائلر کو بتاتا ہے کہ جب بھی کسی فنکشن کا سامنا ہو تو اسے کن پیرامیٹرز اور ریٹرن ٹائپ کی توقع رکھنی ہوگی۔ فنکشن کو ہمیشہ فنکشن سے پہلے ڈکلیئر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہتر ہے کہ کوڈ میں ہیڈر فائل کے فوراً بعد فنکشن کو ڈکلیئر کر دینا چاہیے۔

● نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ریسورسیز سی۔ایس۔آئی۔آر یونٹ نے طلبہ اور عام شائقین میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے "سب کے لیے آئی ٹی سیریز" کے تحت ایسی کتابیں تیار کی ہیں جو کمپیوٹر سے متعلق بنیادی باتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ قارئین "اردو دنیا" کے لیے اس سیریز کی کتاب ""C" ایڈونچر" سے اقتباس پیش ہے۔ اس کتاب کے ایڈیٹر وی۔کے۔گپتا، معاون ڈاکٹر راجیو گپتا اور اردو ایڈیٹر ڈاکٹر رویندر کمار ہیں۔

جب بھی آپ فنکشن کو پروگرام میں کال کریں گے تو آپ کو دو argument دینے ہوں گے (جیسے یہاں دو انٹیجر ز)

یہاں پر C پروگرام کے تحت فنکشن پر عمل اور مناسب جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

```
#include<stdio.h>
/*the function declaration*/
void printAverage(int x, int y, int z);
int main()
{
int a, b, c;
printf("Input 3 integers separated by spaces:");
scanf("%d %d %d", &a, &b, &c);
printAverage(a, b, c); /*the function call*/
return 0;
}
/* the function definiton */
void printAverage(int x, int y, int z)
{
float average = (float) (x+y+z) /3; /*coersion in
pactice! */
printf("The average value of %d, %d and %d is
%f\n",x,y,z,average);
}
```

غور کریں کہ فنکشن کال کرنے میں مجھے تین آرگیومنٹس کو متن پیرامیٹرز کے مساوی فنکشن ڈیفینیشن سے گزرنا پڑا۔ اگرچہ فنکشن پیرامیٹر میں ویریبل کے نام کا فنکشن کال میں مساوی ہونا ضروری نہیں البتہ ڈیٹا ٹائپ کو مساوی ہونا ہوگا۔ مجھے کمپیوٹنگ (x + y + z)/3 سے پہلے فلوٹ استعمال کرنا پڑے گا تاکہ 3 ints کے کمپیوٹنگ کے بعد int ویلیو کو فلوٹ میں تبدیل ہوتا ہے اور یہ عمل اسٹور ہونے سے پہلے ہوگا۔

مذکورہ پروگرام کا آؤٹ پٹ 1 کو داخل کیے جانے کے بعد ,5,2 اور 7 ہوگا۔

ان پٹ 3 انٹیجر ز کی خالی جگہ 257 سے الگ کیا جائے گا۔

5,2 اور 7 کی ایوریج ویلیو 4.666667 ہوگی۔

void لفظ کے استعمال نے پرنٹ ایوریج فنکشن کے لیے کوئی بنیادی نتیجہ نہیں پیش کیا ہے۔

اسٹیٹ منٹ، یہ زیادہ تر مرتب کرتا لیکن اس پر زور نہیں دیا جاتا۔

ایک اور مثال کو دیکھتے ہیں۔ اب آپ بتائیں کہ اس کا یہ حصہ کیا کام انجام دیتا ہے

```
#include<stdio.h>
#include<math.h>
float pythagoras(int x, int y);
int main()
{
int a,b;
printf("Input length and breath of the right angle:");
scanf("%d %d", &a, &b);
printf("\n The hypotenuse of the triangles is %f\n",
pythagoras(a,b));
return 0;
}
float pythagoras(int x, int y)
{
float hypotenuse;
hypotenuse = sqrt(pow(x,2) + pow(y,2));
return hypotenuse;
}
```

ہم نے پروگرام میں math.h فائل کو داخل کیا ہے کیونکہ مجھے اس پروگرام میں ایک میتھمیٹکل کمپیوٹیشن پر کرنا ہے اس پروگرام میں شامل فنکشن math.h فائل میں ڈیفائن کر دیا گیا ہے۔ فنکشن میں دو آرگیومنٹس ہیں ایک نمبر اور ایک اسکا پاور۔ sqrt a2 فنکشن میں دو آرگیومنٹس ہیں ایک میں موجود نمبر کا اسکوائر روٹ نکالتا ہے۔ اس مثال میں یہ (a2+b2) کا اسکوائر روٹ نکلے گا۔

اس پروگرام کا آؤٹ پٹ 5 اور 7 کے داخلے کے بعد ہے:

ان پٹ کی لمبائی اور داہنی طرف کا بریتھ مثلث 57 ہے

اور اس مثلث کا ہایپوٹینس 8.6023325 ہے۔

17.2 اسکوپ

تمام کانسٹینٹس اور ویریبل کے پاس کچھ اسکوپ ہوتے ہیں دوسرے لفظوں میں ان کی ویلیو پروگرام کے بعض حصوں میں قابل عمل ہوتی ہیں جب کہ بعض دوسرے حصوں میں ان کا وجود نظر آتا ہے۔ اسکوپ کی چار قسمیں ہیں۔

بلاک اسکوپ

آپ کو اسٹیٹمنٹس بلاک یاد ہے؟ بلاک تب بنتا ہے جب اسٹیٹمنٹس کو کرلی بریکٹ کے درمیان رکھا گیا ہو۔ اگر ایک ویریبل کو بلاک کے اندر ڈکلیر کر کے انیشلائز کیا گیا ہے تو بلاک کے باہر بقیہ پروگرام اسے استعمال نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے ویریبل کو لوکل ویریبل بھی کہتے ہیں۔

ایک لوکل ویریبل کے لیے بلاک اسکوپ کے استعمال کی مثال درج ذیل ہے:

```
#include <stdio.h>
void tripleints(int a, int b);
```

یہ کوڈ اس طرح کا آؤٹ پٹ دے گا:

The value of x outside the for loop is 120
The value of x inside the for loop is 0
The value of x inside the for loop is 1
The value of x inside the for loop is 2
The value of x inside the for loop is 3
The value of x inside the for loop is 4
The value of x outside the for loop is 120

پروگرام اسکوپ

آپ اپنے فنکشن کے لیے ان آرگیومنٹس سے بچنا چاہتے ہیں تو آپ اپنے ویریبل کو کسی بھی فنکشن بلاک کے باہر رکھ سکتے ہیں۔ ایسے ویریبل کو بعض اوقات Global Variables کہا جاتا ہے۔ ان کی ویلیو کو پورے پروگرام میں کہیں سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے جس کی مثال یہ ہے۔

```
#include<stdio.h>
int x = 12;
void anotherFunction();
int main()
{
printf("The value of x in main is %d\n",x);
anotherFunction();
return 0;
}
void anotherFunction()
{
printf("The value of x outside of main is %d\n",x);
}
```

آؤٹ پٹ ایسا نظر آئے گا:

The value of x in main is 12
The value of x outside of main is 12

چونکہ آپ فنکشن میں عمل کے وقت بہت سے آرگیومنٹس کو نہیں رکھنا چاہتے اس لیے گلوبل ویریبل کو استعمال کر سکتے ہیں کہ یہ کوڈ بہت مناسب ہے اور گیمس کے پروگرام میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

فائل اسکوپ

آپ ایک ایسا ویریبل چاہتے ہیں جو صرف فائل کے آخر میں قابل عمل ہو۔ اس میں سب کچھ آپ کو گلوبل ویریبل کی طرح ہی کرنا ہے۔ بس ایک لفظ static پر ڈیٹا ٹائپ کے پہلے اس طرح سے ایک نشان لگا دینا ہے۔

□□□

```
int main()
{
int a = 1;
int b = 4;
tripleInts(a,b);
printf("The value of a in main is %d, the value of b
is %d\n",a,b);
return 0;
}
void tripleInts(int a, int b)
{
a *=3;
b *=3;
printf("The value of a in tripleInts is%d, the value of
b is %d\n",a,b);
}
```

اس کوڈ کا آؤٹ پٹ اس طرح ہے:

The value of a in tripleInts is 3, the value of b is 12
The value of a in main is 1, the value of b is 4

Main() میں ویریبل کے لیے میموری سلائس محفوظ رہتی ہیں۔ اور triple int میں اس ویریبلو کے لیے ایک نئی میموری محفوظ ہوگی۔ اگر چہ دونوں کے پاس نام ایک ہی ہیں لیکن دونوں ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتے ہیں۔

اگر آپ ایک ویریبل x کو لوپ کے باہر بتانا چاہتے ہیں اور دوسرے ویریبل x کو لوپ کے اندر بتانا چاہتے ہیں تو یہ دونوں مختلف میموری سلائس لیں گے۔

جسے درج ذیل مثال میں دیکھا جا سکتا ہے:

```
#include<stdio.h>
int main()
{
int x = 120;
int i;
printf("The value of x outside the for loop is
%d\n",x);
for(i=0 ; i<5 ; i++) {
int x = i;
printf("The value of x inside the for loop is %d\n",x);
}
printf("The value of x outside the for loop is
%d\n",x);
return 0;
}
```

فیاض عالم کوئز

اردو زبان وادب (افسانوں کے کردار)

کوئز کے صحیح جوابات بھیجنے والے قارئین کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام دیا جائے گا۔ پہلا انعام 500 روپے، دوسرا انعام 300 روپے اور تیسرا انعام 200 روپے پر مشتمل ہے۔ انعام کے طور پر کونسل کی مطبوعات ارسال کی جائیں گی۔ آپ کے جوابات ہمیں اس مہینے کی 15 تاریخ تک موصول ہونے چاہئیں۔ (ادارہ)

(1) گھیسو اور مادھو، پریم چند کے کس مشہور افسانے کے کردار ہیں؟
(الف) گلی ڈنڈا (ب) روشنی
(ج) کفن (د) ان میں سے کسی کے نہیں

(2) پریم چند کے افسانے ''پوس کی رات'' میں کس کردار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے؟
(الف) ہلکو (ب) دیوناتھ
(ج) امرکانت (د) ان میں سے کسی کو نہیں

(3) ''نمک کا داروغہ'' کا مرکزی کردار کون ہے؟
(الف) بنسی دھر (ب) رائے صاحب
(ج) پنڈت الوپی دین (د) ان میں سے کوئی نہیں

(4) مندرجہ ذیل میں سے کس کردار کا تعلق پریم چند کے افسانے ''بڑے گھر کی بیٹی'' سے ہے؟
(الف) آنندی (ب) لال بہاری
(ج) شری کنٹھ سنگھ (د) مذکورہ تینوں کردار

(5) جمن شیخ اور الگو چودھری کس افسانے کے کردار ہیں؟
(الف) پنچایت (ب) آخری تحفہ
(ج) ماں (د) ایمان کا فیصلہ

(6) پریم چند کے افسانے ''منتر'' کا مرکزی کردار کون ہے؟
(الف) کیلاش (ب) مرنالنی
(ج) ڈاکٹر چڈھا (د) بھگت

(7) سلطانہ کا تعلق سعادت حسن منٹو کے کس افسانے سے ہے؟
(الف) کالی شلوار (ب) شادی
(ج) چغد (د) ان میں سے کسی سے نہیں

(8) ایشر سنگھ اور کلونت کور، منٹو کے کس افسانے کے کردار ہیں؟
(الف) پھندنے (ب) بو
(ج) ٹھنڈا گوشت (د) گورکھ سنگھ کی وصیت

(9) منگو کوچوان، منٹو کے کس افسانے کا کردار ہے؟
(الف) نیا قانون (ب) ٹوبہ ٹیک سنگھ
(ج) یزید (د) لائسنس

(10) منٹو کے افسانے ''ساڑھے تین آنے'' کا مرکزی کردار کون ہے؟
(الف) رضوی (ب) پھگو بھنگی
(ج) منٹو (د) ان میں سے کوئی نہیں

(11) منٹو کے ایک افسانے کا مرکزی کردار ایک بچہ ہے جو ایک پولیس انسپکٹر کے گھر نوکر ہے۔ صبح چھ بجے سے رات گیارہ بجے تک اسے مسلسل کام کرنا پڑتا ہے۔ کام سے بچنے کے لیے وہ بار بار اپنی انگلی کاٹ لیتا ہے۔ اس افسانے کا نام بتایئے؟
(الف) فرشتہ (ب) جی آیا صاحب
(ج) چغد (د) لذت سنگ

(12) سوگندھی، کس افسانے کی کردار ہے؟
(الف) ہتک (ب) ممد بھائی
(ج) سرکنڈوں کے پیچھے (د) پھندنے

(13) کالو بھنگی ایک مشہور کردار ہے۔ اس کے خالق کا نام کیا ہے؟
(الف) منٹو (ب) کرشن چندر
(ج) راجندر سنگھ بیدی (د) ان میں سے کوئی نہیں

(14) ''رنڈی کا کوٹھا اور پیر کا مزار دونوں جگہوں پر فرش سے لے کر عرش تک دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے۔'' یہ بیان منٹو کے کس کردار کا ہے؟
(الف) ممد بھائی (ب) موذیل
(ج) بابو گوپی ناتھ (د) ان میں سے کسی کا نہیں

(15) منٹو کے شاہکار افسانے ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' کا مرکزی کردار کون ہے؟
(الف) بشن سنگھ (ب) بلبیر سنگھ
(ج) ودھاوا سنگھ (د) روپ کور

(16) راجندر سنگھ بیدی کے کس افسانے کے کردار کا نام ہولی ہے؟

(الف) گرہن (ب) لمبی لڑکی

(ج) رحمن کے جوتے (د) حجام الہ آباد کے

(17) اندو، راجندر سنگھ بیدی کے کس افسانے کی مرکزی کردار ہے؟

(الف) کوکھ جلی (ب) دانہ ودام

(ج) اپنے دکھ مجھے دے دو (د) دس منٹ بارش میں

(18) راجندر سنگھ بیدی کے افسانے لاجونتی میں لاجو کا شوہر کون ہے؟

(الف) سندر لال (ب) شیام لال

(ج) بھولا (د) ان میں سے کوئی نہیں

(19) کبریٰ کا کردار عصمت چغتائی کے کس افسانے میں ملتا ہے؟

(الف) لحاف (ب) چوتھی کا جوڑا

(ج) بچھو پھوپھی (د) ننھی کی نانی

(20) عصمت چغتائی کے کس افسانے میں روپ چند کا کردار ملتا ہے؟

(الف) دو ہاتھ (ب) بھول بھلیاں

(ج) جڑیں (د) ساس

(21) بیگم جان اور ربو کا تعلق عصمت چغتائی کے کس مشہور افسانے سے ہے جس کو مخرب اخلاق قرار دے کر حکومت نے فروری 1945 میں ان پر مقدمہ چلایا تھا؟

(الف) لحاف (ب) دو ہاتھ

(ج) گیندا (د) ساس

(22) خواجہ احمد عباس نے اپنے افسانے "ابابیل" میں ایک ایسے شخص کو کردار بنایا ہے جس کی مار پیٹ سے تنگ آ کر اس کی بیوی اور دونوں بیٹے گھر سے بھاگ جاتے ہیں۔ آخر میں اس کی موت کے وقت سوائے ابابیل کے بچوں کے کوئی نہیں ہوتا جنھیں اس نے بارش میں بھیگنے سے بچایا تھا۔ اس کردار کا نام کیا ہے؟

(الف) رحیم خاں (ب) رفیق

(ج) سردار جی (د) ان میں سے کوئی نہیں

(23) حیات اللہ انصاری کے اس مشہور افسانے کا نام بتایئے جس میں گھیسے اور فقیرا اپنی بوڑھی اور معذور ماں کو بھیک مانگنے کا ذریعہ بناتے ہیں؟

(الف) ڈھائی سیر آٹا (ب) کمزور پودا

(ج) انوکھی مصیبت (د) آخری کوشش

(24) حجاب امتیاز علی کے اس افسانے کا نام بتایئے جس میں سو سال کا ایک بوڑھا ملاح روحی کو اپنی کہانی سناتا ہے جس میں کاسنی گلاب کی وجہ سے اس کی بیوی کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا؟

(الف) صنوبر کے سائے (ب) نیلا لفافہ

(ج) محبت یا ہلاکت (د) شامت اعمال

(25) "آنندی" ایک ایسا افسانہ ہے جس میں کسی فرد کی بجائے پورا شہر کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ افسانہ کس نے لکھا ہے؟

(الف) رام لعل (ب) غلام عباس

(ج) اپندر ناتھ اشک (د) عزیز احمد

(26) ایک اجنبی سیلانی سیکر کے ڈاک بنگلے میں ٹھہرتا ہے۔ وہ ڈاک بنگلے کے چوکیدار سے لڑکیاں منگاتا ہے اور بغیر قیمت وصول کیے واپس کر دیتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے اس مشہور افسانے "رئیس خانہ" میں چوکیدار کا نام کیا ہے؟

(الف) فضلو (ب) ولی محمد

(ج) امامی (د) الیاس

(27) اشفاق احمد کے افسانے "گڈریا" کا مرکزی کردار کون ہے؟

(الف) داؤ جی (ب) گڈریا

(ج) واحد متکلم (د) ان میں سے کوئی نہیں

(28) "آخری آدمی" انتظار حسین کا مشہور افسانہ ہے جس میں گاؤں کے تمام لوگوں کے چہرے یکے بعد دیگرے مسخ ہوتے جاتے ہیں۔ آخر میں افسانے کے مرکزی کردار کا چہرہ بھی مسخ ہو کر بندر جیسا ہو جاتا ہے۔ اس کردار کا نام کیا ہے؟

(الف) یاجوج (ب) ماجوج

(ج) الیاسف (د) ان میں سے کوئی نہیں

(29) مجنوں گورکھپوری کے افسانے "ظفر کا باپ" میں ظفر کے باپ کا نام کیا ہے؟

(الف) خلیل (ب) محسن

(ج) قمر (د) ان میں سے کوئی نہیں

(30) قاضی انعام حسین کا کردار قاضی عبدالستار کے کس افسانے میں ملتا ہے؟

(الف) رضو باجی (ب) ٹھاکر دوارہ

(ج) پیتل کا گھنٹہ (د) ماڈل ٹاؤن

(31) طارق چھتاری کے افسانے "نیم پلیٹ" کا مرکزی کردار کون ہے؟

(الف) کیدارناتھ (ب) بیج ناتھ

(ج) سریندر ناتھ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(32) سانول کا کردار سہیل عظیم آبادی کے کس افسانے میں ہے؟

(الف) الاؤ (ب) کوئلے والا

(ج) جینے کے لیے (د) ان میں سے کسی میں نہیں

(33) سید محمد محسن کے افسانے "انوکھی مسکراہٹ" کا مرکزی کردار کون ہے؟

(الف) جمنی (ب) حنیف

(ج) شاہ صاحب (د) ان میں سے کوئی نہیں

(34) "شیخ و برہمن" ایک مشہور افسانہ ہے جس میں شیخ جمن اور پنڈت جٹا شنکر کی دوستی کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس کے تخلیق کار کون ہیں؟

(الف) پریم چند (ب) اعظم کریوی

(ج) سدرشن (د) سہیل عظیم آبادی

(35) "کابلی والا" رابندر ناتھ ٹیگور کا مشہور افسانہ ہے۔ اسی کردار کو بنیاد بنا کر اردو میں ایک افسانہ "کابلی والا کی واپسی" کے عنوان سے تحریر کیا گیا۔ اس کے تخلیق کار کا نام کیا ہے؟

(الف) شوکت حیات (ب) انور قمر

(ج) ترنم ریاض (د) ان میں سے کوئی نہیں

(36) شامو دادا کا کردار سلام بن رزاق کے کس افسانے میں ملتا ہے؟

(الف) معبر (ب) چادر

(ج) انجام کار (د) شکستہ بتوں کے درمیاں

(37) "مائیکل انجلو" کو کردار بنا کر کس نے افسانہ لکھا ہے؟

(الف) گلزار (ب) شموئل احمد

(ج) انجم عثمانی (د) ساجد رشید

(38) شیر شاہ سوری (فرید خاں) کا کردار افسانہ "خانم" میں پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے کے مصنف کون ہیں؟

(الف) حسین الحق (ب) جیلانی بانو

(ج) طارق چھتاری (د) قمر جہاں

□□□

ہمیں فروری کوئز انعامی مقابلے کے متعدد جوابات موصول ہوئے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل حضرات کو بالترتیب اوّل، دوم اور سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

1. عبدالرب

252، سابرمتی ہاسٹل، جے۔این۔یو۔، نئی دہلی۔ 110067

2. درخشاں زریں

بنت جناب محمد ابونصر ظہیری

محلّہ عماد پور، بہار شریف

ضلع نالندہ۔ 803101 (بہار)

3. محمد فہیم

734، اولڈ کٹرا

الٰہ آباد۔ 211002 (اتر پردیش)

انعام یافتگان کو ادارے کی جانب سے مبارک باد۔

آپ کے انعامات جلدی بذریعۂ ڈاک ارسال کردیے جائیں گے۔

(ادارہ)

فروری انعامی مقابلے (کوئز) کے صحیح جوابات:

1. الف 2. ب 3. الف 4. الف 5. ب
6. ج 7. د 8. ج 9. ج 10. د
11. ب 12. ب 13. ج 14. د 15. ب
16. الف 17. الف 18. د 19. الف 20. د
21. د 22. ج 23. الف 24. ب 25. الف
26. الف 27. الف 28. ب 29. ج 30. الف
31. د 32. الف 33. ب 34. الف 35. ب
36. الف 37. ج 38. ب 39. ب 40. ب
41. ج 42. د 43. الف 44. ج 45. الف
46. الف 47. الف 48. د 49. ب 50. ج

محمد امتیاز عالم کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو۔32

بڑھتے قدم

محمد رافع الہدیٰ نے ابتدائی تعلیم ککڑوا مڈل اسکول، ارریہ اور میٹرک آزاد اکیڈمی، ارریہ سے پاس کرنے کے بعد انٹر میڈیٹ ارریہ کالج، ارریہ سے اور پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ سے بی۔اے (آنرس) کرنے کے بعد اسی یونیورسٹی سے بی۔لب کیا۔آئی۔ایس۔سی کرنے کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ایک سالہ ڈپلوما ان کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی بہار اردو اکادمی پٹنہ سے مکمل کیا اور فی الحال خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں ملازمت کر رہے ہیں۔ ان کا مختصرانٹرویو قارئین ''اردو دنیا'' کے لیے پیش ہے۔

سوال: آپ کو کمپیوٹر سے دلچسپی کیسے ہوئی؟

جواب: کسی بھی شخص کی ایک دلی خواہش ہوتی ہے جسے پانے کے بعد بے حد خوشی ہوتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ کمپیوٹر کے بغیر تعلیم ناممکن تو نہیں لیکن ادھوری ضرور ہے یہی وجہ ہے کہ کمپیوٹر سے دلچسپی میں اضافہ ہوا۔ اگر چہ مجھے کمپیوٹر سے شروع سے ہی دلچسپی تھی۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: یہاں پر انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو کا سافٹ ویئر بھی پڑھایا جاتا ہے۔ دوسرے سینٹروں کے مقابلے میں یہاں کی فیس بھی کم ہے۔ یہاں کے جاری کردہ سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر ملازمت ملنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: قومی اردو کونسل کے یہ مراکز اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں بہت حد تک معاون ہیں۔ یہاں پر جو تربیت دی جاتی ہے وہ بھی بہت بہتر ہے۔

سوال: انفارمیشن ٹکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: انفارمیشن ٹکنالوجی کا حصہ بن کر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آج میں بھی وقت کی رفتار سے پیچھے نہیں بلکہ وقت کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل رہا ہوں اور بہت ہی کم وقت میں بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہوں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: میرے اندر بہت بدلاؤ آیا ہے، کل تک یہ دنیا میرے لیے ایک عجوبہ تھی اور آج میں اس کا حصہ بن گیا ہوں۔ اس کورس کی وجہ سے میری خود اعتمادی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

سوال: آپ ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: اس انفرادیت کی بنا پر میں اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے بہتر مقام پر پاتا ہوں اور روزگار کے مواقع بھی مزید حاصل ہیں۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: یہاں پر جو فیس ادا کی جاتی ہے اول تو وہ زیادہ نہیں ہے مزید برآں اسے قسطوں میں بھی جمع کرانے کی سہولت فراہم ہے جو دیگر مراکز میں قطعاً ممکن نہیں۔ علاوہ ازیں قومی اردو کونسل کے ضوابط کے مطابق غریب طلبہ کے لیے فیس میں رعایت بھی دی جاتی ہے جو قومی اردو کونسل کا ایک مستحسن قدم ہے۔

□□□

اردو خبرنامہ

داغ دہلوی یادگاری خطبہ

● نئی دہلی، 31 جنوری۔(یو.این.آئی.) ''جس طرح شیر شاہ سوری نے گرینڈ ٹرینک روڈ کے ذریعے پورے ملک کو جوڑ دیا تھا ٹھیک اسی طرح داغ دہلوی نے کشمیر سے کالی کٹ تک اپنے لاتعداد شاگردوں کے ذریعے اردو زبان اور محاورے کو عام کیا۔ داغ دہلوی کی شاعری میں غالب کی فکر اور ذوق کے محاورے کا حسین امتزاج ملتا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار جناب آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے قومی اردو کونسل کی جانب سے غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی میں نواب مرزا خاں داغ دہلوی کی صد سالہ برسی کے موقعے پر منعقدہ جلسے میں اپنے کلیدی خطبہ میں کیا۔ جلسے کے آغاز میں قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر آر۔کے۔ بھٹ نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور کہا کہ داغ دہلوی ہمارے ان عظیم شعرا میں سے ہیں جنھوں نے اردو کی ترویج و اشاعت میں عملی حصہ لیا۔ جناب مخمور سعیدی نے جلسے میں 'داغ اور غالب' کے عنوان سے ان دونوں عظیم شاعروں کے تعلقات پر بھرپور روشنی ڈالی۔ پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے کہا کہ اردو شاعری کی تاریخ میں داغ واحد شاعر ہیں جن کے کلام میں زندگی کی تمام کیفیات کی ترجمانی ملتی ہے۔ جناب شمس الرحمن فاروقی نے دہلی اور بیرون دہلی کے ادبی اداروں اور انجمنوں سے گزارش کی کہ وہ داغ کی شاعری اور خدمات سے نئی نسل کو واقف کرائیں۔ آخر میں ڈاکٹر آر۔کے۔ بھٹ نے تمام شرکا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر شاہد ماہلی، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر عبدالودود اظہر کے علاوہ اساتذہ اور طلبہ کی بڑی تعداد موجود تھی۔

عالمی اردو کانفرنس

● حیدرآباد، 14 جنوری۔ گورنر آندھرا پردیش جناب سشیل کمار شندے نے حیدرآباد کو اردو زبان اور تہذیب کا گہوارہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ''اردو کی ترقی و ترویج کے لیے حیدرآباد میں ایک بہت بڑے ریسرچ سنٹر کی ضرورت ہے۔'' وہ جوبلی ہال میں عالمی اُردو کانفرنس کا افتتاح کر رہے تھے جس کا اہتمام ادارہ ''سیاست'' کی جانب سے کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ حیدرآباد میں اردو زبان اور اردو تہذیب کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ یہ زبان کبھی مٹ نہیں سکتی۔ ۔ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر راج شیکھر ریڈی نے اپنی تقریر میں عالمی اردو کانفرنس کے انعقاد پر جناب زاہد علی خاں کی کاوشوں کی ستائش کی اور کہا کہ حکومت اردو زبان کی ترقی، ترویج و اشاعت کی پابند ہے۔ انھوں نے ریاست کے 13 اضلاع میں اردو کی بحیثیت دوسری سرکاری زبان عمل آوری کا تیقن دیا اور کہا کہ سرکاری زبان کمیشن میں اردو کے ایک نمائندے کو اس لیے شامل کیا گیا تاکہ وہ سرکاری سطح پر اردو کے استعمال کا جائزہ لے۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ ان کی حکومت ہر ضلع میں ایک اردو اقامتی ہائی اسکول قائم کر رہی ہے۔

عالمی اردو کانفرنس کے دوسرے روز ''اردو تحقیق اور تنقید کے عصری تقاضے'' کے موضوع پر سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے صدر ساہتیہ اکیڈمی پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کہا کہ اس ملک میں صرف زبان اردو کو فرقہ وارانہ رنگ دیا گیا تاہم اردو ادب عالیہ کل کی طرح آج بھی فرقہ واریت اور سیاسی آلودگی سے مکمل طور پر پاک ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی 10 شمالی ریاستوں کے 50 کروڑ افراد بنام ہندی اردو ہی بولتے ہیں۔ پارلیمنٹ اور دیگر ایوانوں میں اردو شاعری ہی گونجتی ہے۔ یہ اردو والوں کی ذمے داری ہے کہ وہ اردو کے حقوق کے لیے کوشاں رہیں اور اپنی تہذیبی و ثقافتی ذمہ داریوں کو محسوس کریں۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ ہر عہد کی ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں کا پس منظر وہ تصور شعر و ادب ہوتا ہے جو تنقید کے لیے بھی نظریاتی اساس فراہم کرتا ہے اور ادبی افکار کے خدوخال بھی متعین کرتا ہے۔ اردو میں ادبی تنقید کی تاریخ بہت پرانی نہ سہی تاہم کم ازکم ایک صدی پر اس طرح پھیلی ہوئی ضرور ہے کہ ابتدائی نصف صدی کو ہم مشرقی اور مغربی ادبی تصورات کے آمیزے اور بعض عمومیت پسندانہ نظریاتی بنیادوں کی تشکیل کا زمانہ ضرور قرار دے سکتے ہیں۔ پروفیسر محمد زماں آزردہ نے کہا کہ اردو زبان میں جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے اس کی تحقیق کی جانی چاہیے۔ پروفیسر نظام صدیقی نے کہا کہ اردو، دنیا کی دوسری بڑی زبان ہے۔ دنیا بھر میں اردو بولنے والوں کی تعداد 38 کروڑ 86 لاکھ سے زائد ہے اور مختلف گوشوں سے اقوام متحدہ سے یہ مطالبہ کیا جارہا ہے کہ اسے اقوام متحدہ کی سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اس موقعے پر سکریٹری ادارۂ ادبیات اردو پروفیسر مغنی تبسم نے بھی مخاطب کیا۔ جبکہ آمنہ بیگم نے جلسے کی نظامت کی۔

عالمی اردو کانفرنس کے تیسرے اور آخری دن ''اردو ذریعۂ تعلیم اور اکیسویں صدی کے چیلنج'' کے عنوان سے اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر اے۔ایم۔ پٹھان نے کہا کہ اردو یونیورسٹی اردو زبان کی تعلیم و تدریس کو موثر اور عصری بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو

ذریعۂ تعلیم کی ترقی و ترویج کے لیے معیاری اسکول ہی نہیں معیاری اساتذہ کی بھی اشد ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر اردو ذریعۂ تعلیم کے لیے اکیسویں صدی کے چیلنج سے نمٹنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو یونیورسٹی کی جانب سے ملک بھر میں اساتذہ کی مطلوبہ تعداد کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے روایتی اور فاصلاتی طرز تعلیم کے تحت بی۔ ایڈ اور ڈی ایڈ کورس چلائے جا رہے ہیں جن کے حوصلہ افزا نتائج بھی برآمد ہو رہے ہیں۔ مہمان خصوصی جناب خلیل الرحمن، ایڈیٹر اردو ٹائمز نیویارک نے اس موقعے پر اپنے خطاب کے دوران مشرق و مغرب میں اردو کے مسائل کو مختلف قرار دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان میں اردو ذریعۂ تعلیم کے مسائل بنیادی سطح پر کچھ زیادہ ہیں۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے کیے جانے والے اقدامات کو سماجی اور معاشی ضرورتوں سے ہم آہنگ کرنے کی وکالت کی۔ جناب منظور الامین، سابق ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل، دور درشن نے اپنے مقالے میں الکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی تیز رفتار ترقی سے استفادہ کرتے ہوئے اردو ذریعۂ تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے اور اردو کو عصری علوم و فنون سے جوڑنے کی ضرورت پر زور دیا۔ پروفیسر رحمت یوسف زئی، سابق صدر شعبۂ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے اردو ذریعۂ تعلیم کو ثانوی سطح پر درپیش مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے اردو والوں سے مادری زبان کی اہمیت کو سمجھنے اور اردو ذریعۂ تعلیم کی ترقی و ترویج میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے متحدہ کوششیں کرنے پر زور دیا۔ ڈاکٹر وسیم بیگم، اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر اردو یونیورسٹی نے فاصلاتی نظام تعلیم کے مسائل پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اس سیمینار میں ممتاز شاعر پدم شری بیکل اُتساہی، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر ایس۔ اے۔ وہاب قیصر، جناب زاہد علی خاں، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ کے علاوہ ادبا، شعرا، دانشوروں اور قومی و بین اقوامی شخصیات کی بڑی تعداد موجود تھی۔ عالمی اردو کانفرنس کے آخری دن ''عہد جدید میں رثائی ادب'' کے زیر عنوان منعقدہ اجلاس کی صدارت پروفیسر سیدہ جعفر نے کی۔ انھوں نے کہا کہ رثائی ادب نے ہر دور میں سماجی و تہذیبی تبدیلیوں کے بعد بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دور حاضر میں سماجی عدم مساوات، قومی اور انسانی امتیازات کے باعث بھی اس صنف پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ آج اس کی عوامی مقبولیت میں کمی آ رہی ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی (کینیڈا) نے ادب میں مرزا دبیر سے برتی جانے والی بے اعتنائی کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ 275 مرثیے، 300 سے زائد رباعیاں اور بیس ہزار سے زائد اشعار کہنے والے شاعر کو اردو ادب میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق ہیں۔ ڈاکٹر نکہت جہاں، استاد شعبۂ فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور پروفیسر زماں آزردہ نے بھی اس اجلاس میں مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر شجاعت علی راشد نے جلسے کی نظامت کی۔

(سیاست، منصف۔ حیدرآباد)

دکنی ادب کی تحقیق و تدوین پر سیمینار

● حیدرآباد، 24 جنوری۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے تحقیقی کام کو آگے بڑھانے کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو ایک جامع تجویز پیش کی جائے گی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان وائس چانسلر اردو یونیورسٹی نے شعبۂ اردو کی جانب سے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی یاد میں منعقد کیے جا رہے دو روزہ سیمینار ''دکنی ادب۔ تحقیق و تدوین'' کے افتتاحی اجلاس سے اپنے صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ قبل ازیں پروفیسر خالد سعید صدر شعبۂ اردو نے تعارفی کلمات پیش کیے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے اپنے خطاب کے دوران دکنی کو اردو کی تعمیری اساس اور مبدا قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ دکنی شعر و ادب میں ترسیل و ابلاغ کے جوہر پوشیدہ ہیں نیز تنقید کے ابتدائی نقوش ہی نہیں اردو زبان و ادب کا گراں قدر سرمایہ بھی دکنی ادب میں موجود ہے۔ پروفیسر سیدہ جعفر نے ایک فرانسیسی اسکالر کو وجہی کی سب رس پر تحقیق کے لیے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کیے جانے کا ذکر کرتے ہوئے دانش گاہوں میں دکنی تحقیق و تدوین کے علاوہ دکنی ادب پاروں کے تحفظ کی ضرورت پر زور دیا۔ پروفیسر مغنی تبسم سابق (صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ) معتمد ادارہ ادبیات اردو نے کہا کہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنے یورپ کے تعلیمی سفر کے بعد لسانیات اور دکنی ادب پر قابل لحاظ کام کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ شمالی ہند کی کسی بھی یونیورسٹی میں دکنی کو صحیح طور پر پڑھنے اور پڑھانے والے اساتذہ موجود نہیں ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم نے دکنی شعر و ادب کے آڈیو کیسٹ کی تیاری کو وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیا تاکہ طلبہ اور اساتذہ ان سے استفادہ کرتے ہوئے دکنی کا صحیح تلفظ ادا کر سکیں۔ ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی استاد شعبۂ اردو نے افتتاحی اجلاس کے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جناب آفتاب عالم بیگ، لکچرر شعبۂ ماس کمیونیکیشن اور جرنلزم نے کلمات تشکر پیش کیے۔ پروفیسر سیدہ جعفر کی صدارت میں سیمینار کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر فاطمہ پروین صدر شعبۂ اردو یونیورسٹی کالج فار ویمنس نے ''دکنی ادب میں پروفیسر زور کی تحقیقی خدمات'' اور پروفیسر محمد عبدالحمید اکبر صدر شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی نے ''دکنی ادب کا مذہبی ورثہ'' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔ اس کے بعد پروفیسر مغنی تبسم کی صدارت میں منعقد آخری اجلاس میں پروفیسر اشرف رفیع، سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے ''آغا حیدر حسن اور دکنی ادب'' ڈاکٹر محمد نسیم الدین فریس استاد شعبۂ اردو حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی نے

''دکنی ادب کی تحقیق و تدوین میں عثمانیہ یونیورسٹی کا حصہ'' کے عنوان سے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس میں پروفیسر محمد علی اثر کا مقالہ'' دکنی ادب میں تحقیق و تدوین کے ابتدائی کارنامے'' بھی شامل تھا۔ ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ صدر شعبہ تعلیم نسواں اور ڈاکٹر نگہت جہاں لکچرر شعبۂ فاصلاتی تعلیم مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے علی الترتیب مذکورہ بالا اجلاسوں کی کارروائی چلائی۔

سیمینار کے دوسرے دن رجسٹرار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی جناب فاروق احمد نے اختتامی تقریب میں اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی شمالی ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی کے کم از کم ایک اسکالر یا فیکلٹی ممبر کو اردو یونیورسٹی میں دکنی زبان و ادب کی خصوصی تعلیم و تربیت کے لیے بھی تمام سہولتیں فراہم کرے گی۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے حیدرآباد میں ملک کی تمام جامعات کے اردو شعبوں کا ایک مرکز یا انجمن قائم کرنے کے لیے جملہ سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ انھوں نے اردو یونیورسٹی میں دکنی تحقیق کے ایک اعلیٰ مرکز کے قیام کی ضرورت پر زور دیا۔ اس موقع پر دکنی زبان و ادب کی تحقیق میں گراں قدر خدمات انجام دینے کے لیے پروفیسر سیدہ جعفر سابق صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ و سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد، پروفیسر مسعود حسین خاں، سابق صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر عبدالستار دلوی سابق صدر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی اور پروفیسر محمد ہاشم علی سابق صدر شعبۂ اردو میسور یونیورسٹی کو تہنیت پیش کی گئی۔ اس اختتامی اجلاس کے مہمانان خصوصی پروفیسر مظہر فاروقی شعبۂ فاصلاتی تعلیم، پروفیسر اسد نظام شعبۂ ترسیل عامہ و صحافت اور ڈاکٹر کے۔آر۔ اقبال احمد صدر شعبہ و ڈائرکٹر فاصلاتی تعلیم نے بھی خطاب میں اس سیمینار کے انعقاد کے لیے صدر شعبۂ اردو پروفیسر خالد سعید اور تمام مقالہ نگاروں کی ستائش کی۔ ڈاکٹر محمد ظفر الدین ریڈر و صدر شعبۂ ٹرانسلیشن نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور پروفیسر خالد سعید نے کلمات تشکر پیش کیے۔ جلسے میں پروفیسر اسد نظام نے بھی خطاب کیا۔ قبل ازیں پروفیسر اشرف رفیع کی زیر صدارت منعقد ہونے والے سیمینار کے تیسرے اجلاس میں پروفیسر سید سجاد حسین نے ''تمل ناڈو میں دکنی ادب کی تحقیق و تدوین کی روایت'' ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے '' عبدالجبار ملکاپوری محقق دکن'' اور ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی نے ''دکنی ادب میں تحقیق و تدوین کے ابتدائی کارنامے'' کے عنوان سے پروفیسر محمد علی اثر کا مقالہ پیش کیا۔ سیمینار کے چوتھے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر بیگ احساس صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے کی۔ اس سیمینار میں ڈاکٹر نجم السحر شعبۂ تعلیم نسواں نے ''دکنی ادب کی خاتون محققین'' کے عنوانات پر مقالات پیش کیے۔ جناب آفتاب عالم بیگ شعبۂ ترسیل عامہ و صحافت اور ڈاکٹر شمس الہدیٰ دریابادی نے بالترتیب مذکورہ بالا اجلاسوں کی نظامت کی۔

''تحریکِ آزادی میں اردو زبان و ادب کا حصہ'' دو روزہ قومی کانفرنس

● دھارواڑ۔ شعبۂ اردو و فارسی، کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ کی جانب سے 23 رجنوری کو''تحریکِ آزادی میں اردو زبان و ادب کا حصہ'' کے موضوع پر منعقدہ دو روزہ قومی اردو کانفرنس کا افتتاح سائنس الااس نزد کرناٹک یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس دھارواڑ میں مہمانِ خصوصی پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے کیا۔ ڈاکٹر سید سجاد حسین، پروفیسر شعبۂ اردو مدراس یونیورسٹی، چنئی مہمانِ ذی وقار تھے اور صدارت پروفیسر ایم۔ خواجہ پیر، وائس چانسلر، کرناٹک یونیورسٹی؛ دھارواڑ نے کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے بلکہ سارے ہندوستان کی زبان ہے۔ کانفرنس کے کوآرڈینیٹر اور صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر قدیر ناظم سرگروہ نے خیر مقدمی تقریر کی۔ ڈاکٹر ایس۔ اے۔ حسین، صدر شعبۂ اردو کرناٹک کالج دھارواڑ نے اظہار تشکر کیا۔ افتتاحی تقریب کی نظامت ڈاکٹر شکیلہ بانو غوری خان اور عبدالرشید نے کی۔

کانفرنس کے پہلے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر حمید سہروردی، شعبۂ اردو گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ نے کی۔ نظامت پروفیسر محترمہ سلیمہ کولور نے کی۔ جلسے میں ڈاکٹر مجید بیدار، (عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) نے''تحریکِ آزادی میں غیر ملکی اردو رسائل و جرائد کا حصہ''، ڈاکٹر مسعود سراج پروفیسر شعبۂ اردو میسور یونیورسٹی نے''تحریکِ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ'' ڈاکٹر محمد یوسف نائیکواڑی، صدر شعبۂ اردو، کیپٹل کالج دھارواڑ نے'' مجاہد آزادی مولانا حسرت موہانی'' ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، صدر شعبۂ اردو، انجمن کالج بھٹکل نے ''تحریکِ آزادی کی ضبط شدہ نظموں پر ایک نظر'' اور ڈاکٹر جاوید رفاعی، صدر شعبۂ اردو انجمن کالج بلگام نے''تحریکِ آزادی اور اردو شعرا'' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔

آخر میں ایک محفلِ شعر و سخن منعقد ہوئی جس میں مندرجہ ذیل شعرا نے شرکت کی۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر مجید بیدار، ڈاکٹر سید سجاد حسین، ڈاکٹر مسعود سراج، ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ عقیل، جناب مظہر محی الدین، جناب ساغر کرناٹکی، ڈاکٹر سہیل نظام سرگروہ، ڈاکٹر عبدالستار ساحر، ڈاکٹر جاوید رفاعی اور ڈاکٹر قدیر ناظم۔ مشاعرے کی نظامت ڈاکٹر قدیر ناظم سرگروہ نے کی۔

دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر مجید بیدار نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر محمد عقیل پروفیسر شعبۂ اردو کوئمپو یونیورسٹی شیموگہ نے''تحریکِ آزادی اور محمد علی جوہر''، ڈاکٹر ماہ نور زمانی، بنگلور یونیورسٹی بنگلور نے''تحریکِ آزادی میں نظموں کا حصہ'' ڈاکٹر سید اشرف حسین، صدر شعبۂ اردو کرناٹک کالج دھارواڑ نے''تحریکِ آزاد میں مولانا آزادی کی خدمات''، ڈاکٹر عبدالستار

ساحر، ایس۔ وی۔ یونیورسٹی تروپتی نے ''تحریک آزادی اور اردو غزل'' اور ڈاکٹر شکیلہ بانو غوری خان نے ''تحریک آزادی میں پریم چند کی اہمیت'' کے عنوان سے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر محمد یوسف نائیکواڑی نے کی۔

کانفرنس کے تیسرے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر سلیمان اطہر جاوید نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر حمید سہروردی (گلبرگہ) نے ''تحریک آزادی اور اردو فکشن''، عبدالرب نے ''تحریک آزادی میں الہلال و البلاغ کا حصہ'' اور ثناء اللہ سونور نے ''تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ'' کے تحت مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت جناب الیاس احمد پتوگیر نے کی۔

(ڈاک سے)

منٹو پر سیمینار

● پنچکولہ۔ ''منٹو ہمارے عہد کے عظیم افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیوں میں تقسیم کا درد نمایاں ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔'' ان خیالات کا اظہار ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے اکادمی کی جانب سے منعقدہ سعادت حسن منٹو سیمینار کے موقعے پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ بہت کم عمر میں ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ اگر وہ اور زندہ رہتے تو اردو کا افسانوی ادب ان کی تحریروں سے مزید مالا مال ہوتا۔ سیمینار کی مہمانِ خصوصی محترمہ جے وتی شیوکند ڈائرکٹر محکمۂ ماحولیات، ہریانہ نے کہا کہ سعادت حسن منٹو نے نفسیات کے جس شعبے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا، عام طور پر ہمارے قلمکار اس پر لکھنے سے بچتے رہے ہیں۔ لیکن منٹو نے اس نازک موضوع پر نہایت چابک دستی سے اپنے قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ تقریب کے صدر جناب آر۔ کے۔ تنیجا، آئی۔ اے۔ ایس، (سبک دوش) تھے۔

اس سیمینار میں جن مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں جناب آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر، پروفیسر کلیش موہن، ڈاکٹر دیپک نندن، کیدار ناتھ شرما، ڈاکٹر سلطان انجم شامل تھے اور جناب کشمیری لال ذاکر نے اپنی ایک بہت پرانی کہانی ''منٹو اور منٹو'' سنائی۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض شمس تبریزی نے ادا کیے۔ ہریانہ اردو اکادمی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ ہر ماہ کسی نہ کسی اردو شخصیت کے فن اور ان کی تحریروں پر جلسہ منعقد کرتی رہے گی۔

(ڈاک سے)

گوپی چند نارنگ کے اعزاز میں جلسہ

● نئی دہلی، 11 فروری۔ ''ادب زندگی اور سماج کی آواز ہوتا ہے، جب عہد بدلتا ہے تو اس کے ساتھ نظریات بھی تبدیل ہوتے ہیں۔ سماج اور زندگی کے بدلتے تقاضوں کو سمجھنا اور ان سے جڑنا تمام زبانوں کے ادب کے ساتھ اردو زبان کے لیے بھی ضروری ہے۔'' ان خیالات کا اظہار پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر انیکسی میں اپنی 75ویں سالگرہ کے موقعے پر منعقد ''ایک شام: گوپی چند نارنگ کے نام'' کے دوران ایک سوال کے جواب میں کیا۔ اس تقریب کا انعقاد اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے کیا گیا تھا۔ تقریب کی صدارت معروف نقاد پروفیسر قمر رئیس نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر شہزاد انجم نے کی۔

تقریب کی ابتدا میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ گوپی چند نارنگ نے خود کو ادب کی خدمت کے لیے وقف رکھا ہے۔ فکشن، شاعری اور تنقید میں بھی انھوں نے اردو کو ہمیشہ نیا دینے کی کوشش کی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ''گوپی چند نارنگ کا تنقیدی دائرۂ کار'' کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے ذاتی مخاصمت اور پسند و ناپسند کو کبھی ادبی زندگی پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے ''متبادل تنقید کا ایک نام گوپی چند نارنگ'' کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تنقیدی سفر کے کئی سنگ میل ہیں۔ انھوں نے گوپی چند نارنگ کو نئی تھیوری کا مبلغ، مدبر اور مفسر قرار دیا۔ اس سے قبل اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی اور بزرگ شاعر نرمل سنگھ نرمل نے شال پہنا کر ان کا استقبال کیا۔ جلسے میں دہلی کی متعدد علمی و ادبی شخصیات موجود تھیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اخترالایمان کی شاعری پر خطبہ

● نئی دہلی، 18 جنوری۔ ''اخترالایمان کی شاعری ہمارے احساسات کو جھنجھوڑتی ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ذاتی واردات کو کائناتی واردات بنا کر پیش کیا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اخترالایمان کی شاعری اور ان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر لیکچر دیتے ہوئے جناب بیدار بخت نے کیا۔ شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی نے بیدار بخت کے علمی اور ادبی کارناموں سے روشناس کرایا۔ انھوں نے بتایا کہ بیدار بخت عملی طور سے ایک انجینئر ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ادب بھی ان کے مطالعے کا خاص حصہ رہا ہے۔ وہ ایک کامیاب مترجم بھی ہیں۔

بیدار بخت نے اخترالایمان کی زندگی کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ انھوں نے جو کچھ بھی حاصل کیا وہ ان کی سخت محنت اور ریاضت کا نتیجہ ہے۔ ماضی یا گزرا ہوا کل صرف اخترالایمان کے لیے ہی باعث کشش نہیں بلکہ وہ سب کے لیے ہی اہم ہے۔ ان کی نظمیں پڑھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کے ذریعے اپنے حالات کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے، مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ان کی نظموں کا تاثر واقعاتی یا حادثاتی نہیں ہے۔

بیدار بخت نے پگڈنڈی، مفاہمت اور ایک لڑکا کو ان کی بہترین نظمیں قرار دیتے ہوئے کہا کہ اختر الایمان پر کام کرنے کی ابھی بہت گنجائش موجود ہے، لیکن اس طرف لوگوں نے کم توجہ دی ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی اور صدر جلسہ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

میر تقی میر کی شاعرانہ عظمت پر توسیعی خطبہ

● گلبرگہ۔ ''ڈھائی صدی کے دوران جہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں غیر معمولی ترقی ہوئی وہیں اردو ادب میں بھی باکمال اور نابغۂ روزگار اساتذۂ سخن نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ باوجود اس کے ہر زمانے میں استادِ سخن میر تقی میر ہی رہے۔'' ان خیالات کا اظہار حلیمہ ادبی و ثقافتی مرکز کی جانب سے نیشنل کالج میں ''میر تقی میر کی شاعرانہ عظمت'' کے زیرِ عنوان منعقدہ توسیعی خطبے کے دوران ڈاکٹر احمد محفوظ استاد شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کے یہاں جہاں شعری کیفیت پائی جاتی ہے وہیں بے انتہا معنی آفرینی بھی ان کے اشعار میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ میر کی شاعری میں کوئی پیچیدگی نہیں پائی جاتی۔ زبان عام فہم اور سادہ ہے۔ میر کے شعر کو سمجھنے میں کسی فکر و تردد کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ میر کی شاعرانہ عظمت سادگی اور دل سے نکلی ہوئی بات میں پوشیدہ ہے۔ بہت عرصے تک میر پر کوئی جامع تحقیقی مقالہ منظر عام پر نہیں آیا۔ اس ضرورت کے تحت مولوی عبدالحق نے کلام میر کا انتخاب کیا جس کو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہے۔ انھوں نے محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' سے بھی استفادہ کیا اور میر تقی میر کی جو باتیں واضح طور پر پیش نہ ہو سکی تھیں وہ منظر عام پر لائیں اور اس کو خوب تر انداز میں ہمارے عہد کی عبقری شخصیت اور ممتاز ناقد، شاعر، محقق و افسانہ نگار جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے ''شعر شعور انگیز'' میں پیش کرتے ہوئے میر تقی میر کے اسلوب کی وضاحت کی جس سے میر کی شاعرانہ عظمت واضح طور پر اجاگر ہوئی ہے۔ شعر کی شعریات جس کو غزل کا پیمانہ بھی کہا جاتا ہے، میر کے کلام میں موجود ہے۔

ابتدا میں فردوس فاطمہ نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور لبنیٰ شیریں نے تعارف پیش کیا۔ جناب امجد جاوید چیف ٹرسٹی نے حلیمہ ٹرسٹ کی رپورٹ پیش کی اور اس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ حلیمہ ادبی و ثقافتی مرکز کے ذریعے آئندہ نسل کو نہ صرف اردو زبان و ادب کی عظمت سے واقف کروانا ہے بلکہ انھیں اس سے جوڑنے اور زبان و ادب کے فروغ میں حصہ لینے کی رغبت بھی دلانا ہے۔ صدر جلسہ جناب وہاب عندلیب سابق صدر کرناٹک اردو اکادمی نے میر تقی میر کی شاعرانہ عظمت کے متعلق ڈاکٹر احمد محفوظ کے خیالات کی تائید کی۔

(ڈاک سے)

[illegible]

● حیدرآباد، یکم فروری۔ ''مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی آئندہ تعلیمی سال سے ملک کے مختلف گوشوں بالخصوص دیہی علاقوں بشمول خلیجی ممالک میں مقیم اردو یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی ایجوسیٹ (Edusat) چینل کے ذریعے اردو پروگرام پیش کرے گی۔'' ان خیالات کا اظہار پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان، وائس چانسلر نے اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی اور اردو یونیورسٹی کے تعاون و اشتراک سے ملک کے دس مراکز پر فاصلاتی نظامِ تعلیم کے تحت چلائے جا رہے دو سالہ بی۔ ایڈ پروگرام کے کوآرڈینیٹروں اور منتظمین کے لیے منعقد کیے جا رہے دو روزہ اورینٹیشن ٹریننگ پروگرام کی افتتاحی تقریب سے اپنے صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ قبل ازیں ڈاکٹر کے۔ آر۔ اقبال احمد، ڈائرکٹر و صدر شعبۂ فاصلاتی تعلیم نے خیر مقدم کرتے ہوئے اس پروگرام کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر ایم۔ سی۔ شرما، ڈائرکٹر اسکول آف ایجوکیشن، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو یونیورسٹی کی جانب سے تعاون و اشتراک کے معاہدے کے بعد ملک کی دوسری جامعات بھی اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی کے ساتھ تعلیمی معاہدوں کے لیے کوشاں ہیں۔ اس پروگرام میں بی ایڈ کے کوآرڈینیٹروں، ریجنل ڈائرکٹروں، انچارج اور اساتذہ کے علاوہ غیر تدریسی شعبے سے تعلق رکھنے والے اراکین کی کثیر تعداد موجود تھی۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر نظامت فاصلاتی تعلیم ڈاکٹر شہید خاں نے نظامت کے فرائض انجام دیے جبکہ پروفیسر مظہرالدین فاروقی کے کلمات تشکر پر افتتاحی اجلاس کا اختتام عمل میں آیا۔ **(ڈاک سے)**

● شولاپور۔ اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر لکھنؤ، وژن انڈیا کریر اکادمی شولاپور اور مہانگر پالیکا پرائمری اسکول بورڈ شولاپور کی جانب سے اردو پرائمری اساتذہ کا آٹھ روزہ تربیتی کیمپ منعقد کیا گیا۔ بیگم قمرالنسا کاریگر گرلز اسکول میں منعقد اس کیمپ کا افتتاح مہانگر پالیکا اسکول بورڈ شولاپور، کے صدر شری اٹل ناگنے نے کیا۔ اس تقریب کی صدارت یونین ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر جناب نعیم شیخ نے کی۔ جناب وقار احمد شیخ صدر وژن انڈیا کریر اکادمی نے استقبالیہ تقریر کی۔ اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر لکھنؤ کے پرنسپل ڈاکٹر مہاراج کشن کول نے کہا کہ معلم ہمیشہ طلبہ کے لیے ایک مثالی شخصیت ہوتا ہے۔ اس کے نقوش طالب علم کے ذہن پر ہمیشہ رہتے ہیں اس لیے معلم کو چاہیے کہ وہ اپنا کردار بلند رکھے اور معیاری تعلیم دینے کے لیے نئے طریقوں کو اپنائے۔ جناب نعیم شیخ نے کہا کہ جب تک ہماری ابتدائی تعلیم مضبوط و مستحکم نہیں

ہوتی ہم اردو ذریعۂ تعلیم کے مدارس کا معیار بلند نہیں کر سکتے۔ ڈاکٹر میر اشتیاق شیخ اور شمشیر علی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ افتتاحی تقریب کی نظامت جناب رفیق خاں نے کی اور جناب جمیل بیجاپوری نے اظہار تشکر پیش کیا۔

اس آٹھ روزہ تربیتی کیمپ میں ڈاکٹر مہاراج کشن کول نے جن موضوعات پر رہبری کی ان میں لسانیات، صوتیات، حروف تہجی کی شناخت، تدریس کے طریقۂ کار، محاورے کی اہمیت اردو رسم الخط اور اعضائے تکلم، اردو ادب کے اصناف شامل ہیں۔

اس میں جناب اعجاز نبی کاریگر (اقبال اور اردو شاعری)، جناب بشیر پرواز (غزل کی تدریس اور خطوط غالب)، ڈاکٹر فہیم پیرزادہ، ہوسپیٹ (اردو ادب اور طنز و مزاح)، پروفیسر جلیل احمد (دکنی ادب آغاز و ارتقا اور اردو کی نشوونما میں اولیائے کرام کی خدمات)، پروفیسر عبدالرزاق رند (اردو ناول اور افسانہ کل اور آج)، جناب وہاب عندلیب، گلبرگہ (املا و انشاء اور سرسید اور اردو ادب)، پروفیسر شفیع چوبدار (نظم کی تدریس اور حالی اور اردو ادب)، جناب سید سعید احمد (اردو ڈراما)، ڈاکٹر عزیز نداف (اردو اور مراٹھی غزلوں کی بحریں)، پروفیسر ولاس پاترو ڈکر (Stress Management)، پروفیسر الطاف جانواڈکر (Communication Skill) اور جناب وقار احمد شیخ (شخصیت ارتقا) نے اساتذہ کی رہنمائی کی۔ اختتامی تقریب کی صدارت کرناٹک اردو اکادمی کے سابق صدر جناب وہاب عندلیب نے کی۔

(ڈاک سے)

طلبہ کے تحریری و تقریری مقابلے

● بھوپال۔ اقبال مرکز ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ہر سال قومی سطح پر شاعر مشرق علامہ اقبال کی شخصیت اور فن کے حوالے سے تحریری مقابلہ منعقد کیا جاتا ہے۔ اس سال اس کا موضوع '' کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری'' تھا۔

اس موضوع پر ملک کی مختلف یونیورسٹیوں سے 25 مقالات موصول ہوئے۔ پروفیسر حسن مسعود، پروفیسر اظہر راہی اور پروفیسر حیدر عباس رضوی پر مشتمل جیوری نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے نورالدین کو دو ہزار روپے کے پہلے انعام کا مستحق قرار دیا۔ حیدرآباد یونیورسٹی کے شیخ عبدالکریم کو ڈیڑھ ہزار روپے کا دوسرا انعام اور ایک ایک ہزار کے تین خصوصی انعام دلی یونیورسٹی کے محمد شمیم اشرف، بنارس ہندو یونیورسٹی کی شکیبہ عرفان اور جانکی دیوی بجاج کالج کوٹہ راجستھان کی سونیتا چودھری کو دیے گئے۔ ساہتیہ اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر دیویندر دیپک نے بتایا کہ مقالات کے معیار کے مدنظر ان انعامات میں پانچ پانچ سو روپے کے تین خصوصی انعام بڑھا دیے گئے ہیں جو کستوربا کالج بھوپال کی آسیہ ارشاد، جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی کے رضی احمد اور محمد ہدایت کو دیے گئے ہیں۔ (ڈاک سے)

● شہادہ، 22 جنوری۔ بزم نو شہادہ کی جانب سے آل مہاراشٹر اردو، مراٹھی تقاریر، بزل خوانی مقابلہ منعقد ہوا۔ یہ پروگرام چار گروپ پر مشتمل تھا۔ پہلا گروپ مراٹھی تقاریر، دوسرا گروپ اردو تقاریر (برائے خاندیش) تیسرا گروپ اردو تقاریر (خاندیش کے علاوہ اضلاع) اور چوتھا گروپ بزل خوانی۔

پہلے گروپ میں محمد عمران انیس احمد۔ اے۔ٹی۔ٹی۔ ہائی اسکول مالیگاؤں نے اوّل، فاطمہ عبدالحفیظ اینگلو اردو ہائی اسکول دھولیہ نے دوسرا اور نازیہ شیخ ایوب، اردو ہائی اسکول نندربار نے تیسرا مقام حاصل کیا۔ دوسرے گروپ میں عائشہ صدیقہ مسعود احمد، عابد عبدالمغنی گرلس ہائی اسکول دھولیہ نے اوّل۔ توصیف اختر محمد زاہد، محمدیہ اردو بوائز ہائی اسکول دھولیہ نے دوسرا۔ زاہد فضل محمد سلیم پنجاری، ایل۔ ایم۔ سردار ہائی اسکول نے تیسرا مقام حاصل کیا۔ تیسرے گروپ میں کاشف اختر خلیل احمد، اے۔ٹی۔ٹی۔ ہائی اسکول مالیگاؤں نے اوّل خنسا عبدالمجید، سوئس ماڈل اسکول مالیگاؤں نے دوسرا۔ انصاری جویریہ اشفاق احمد، خاتون تجمن ہائی اسکول، مالیگاؤں نے تیسرا مقام حاصل کیا۔ چوتھے گروپ میں زاہد فضل محمد سلیم پنجاری، ایل۔ایم۔ سردار ہائی اسکول دھولیہ نے پہلا۔ محمد اظہر صغیر پٹیل، ضلع پریشد اردو اسکول، تاچن کھیڑا نے دوسرا۔ زبیر عمر دراز پٹیل ملت ہائی اسکول تاچن کھیڑا نے تیسرا مقام حاصل کیا۔

(ڈاک سے)

مختصرات

● مئو ناتھ بھنجن، 12 جنوری۔ اورینٹل لائبریری مئو ناتھ بھنجن کی جانب سے ایک علمی و تربیتی مذاکرہ منعقد کیا گیا جس میں موجودہ دور میں ہندی صحافت کی ضرورت، میڈیا سے دوری کے اسباب اور نقصانات، صحافت میں طلبہ کا عملی قدم اور موجودہ اردو صحافت کا معیار جیسے موضوعات پر مولانا فضل الرحمن انصاری مدیر ہفت روزہ '' بنکر پروکتا'' ڈاکٹر شکیل احمد سکریٹری یو۔ پی۔ رابطہ کمیٹی ضلع مئو، مولانا اسعد اعظمی مدنی اور امیر حمزہ اعظمی نے خطاب کیا۔

اس موقعے پر معروضی سوالات پر مبنی شاہنواز احمد کی کتاب '' جدید ذخیرۂ فن'' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ جلسے کی نظامت ماسٹر رفیق اشفاق نے کی۔

(ڈاک سے)

● گلبرگہ، 5 جنوری۔ انجمن ترقی اردو گلبرگہ نے آل انڈیا اردو منچ، بنگلور کی جانب سے جناب وہاب عندلیب کو عطا کردہ محمود ایاز ایوارڈ کی رقم سے

کرناٹک میں پی۔یو۔سی۔ سال دوم حصہ اوّل کے تحت سالانہ امتحان میں اردو زبان میں سب سے زیادہ نشانات حاصل کرنے والے امیدوار کو ہر سال طلائی تمغہ عطا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انجمن کو بورڈ کی جانب سے موصولہ ریکارڈ کے تحت مارچ 2005 کے سالانہ امتحان میں حسب ذیل امیدواروں کو منتخب کیا گیا ہے۔انعامات کے لیے اردو زبان کے علاوہ مجموعی نشانات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔محمدی سائرہ بانو، روحی تمثیل فاطمہ اور شیریں بانو بینڈی گری۔

(ڈاک سے)

● پنچکولہ۔ممتاز ادیب جناب کشمیری لال ذاکر کو پدم شری سے سرفراز کیے جانے کے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس کے مہمانِ خصوصی جنرل بی.کے.این. چھبر سابق گورنر پنجاب تھے۔ اس جلسے کی صدارت جناب پروین کمار (آئی.اے.ایس.) ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر پنچکولہ نے کی۔اس موقعے پر جناب کشمیری لال ذاکر نے کہا کہ میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ اچھا ادب تخلیق کیا جائے۔تقریب میں پروفیسر کملیش موہن نے ذاکر صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر دیپک ٹنڈن، شمس تبریزی، ڈاکٹر فرزانہ نسیم اور ڈاکٹر محمد ایوب خاں نے ذاکر صاحب کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈالی۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض شمس تبریزی نے انجام دیے۔

● سیتاپور۔ بزمِ اردو سیتاپور کے پینتیسویں یومِ تاسیس کے موقعے پر ممتاز ناول نگار پروفیسر قاضی عبدالستار کو دوحہ (قطر) میں عالمی ادب ایوارڈ ملنے پر استقبالیہ دیا گیا۔ بزم اردو کے بانی جنرل سکریٹری اور معروف شاعر مست حفیظ رحمانی نے استقبالیہ تقریر کی۔ بزمِ اردو کے سکریٹری رضوان خاں نے کہا کہ قاضی صاحب نے نہایت اہم اور قابل قدر ناول لکھے ہیں۔ اس موقعے پر شاعر تسنیم فاروقی کی کتاب ''رحل'' کی رسمِ اجرا قاضی صاحب کے ہاتھوں عمل میں آئی۔قاضی صاحب نے بزم اردو کا ادب ایوارڈ متعدد شعرا و ادبا کو تقسیم کیا جن میں تسنیم فاروقی، خالد علوی، اشتیاق علی صبا، دبیر سیتاپوری، منظر یٰسین، طارق قمر، خان احمد صدیق اور صادق علی انصاری کے نام شامل ہیں۔ اس موقعے پر قاضی عبدالستار نے کہا کہ اردو قومی یکجہتی کو فروغ دینے والی وہ میٹھی زبان ہے جس نے ہمیشہ حب الوطنی اور امن و امان کو بڑھاوا دیا ہے۔ جلسے میں اقبال محشر رائے بریلوی، ڈاکٹر شمر سنبھلی، عارف محمد عارف، اشتیاق علی صبا، ابوالمجاہد، خالد فتح پوری، خالد علوی، شارق ہرپوری، بدر سیتاپوری اور عمران سیتاپوری نے بھی اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی نظامت رضوان خاں نے کی۔

● پٹنہ، 30 جنوری۔ حلقۂ ادب بہار کی مجلس عاملہ نے ایک مرتبہ پھر اردو کے ممتاز ناقد پروفیسر عبدالمغنی کو آئندہ پانچ سال کے لیے اتفاق رائے سے حلقۂ ادب بہار کا صدر اور اردو کے معروف افسانہ نگار جناب فخرالدین عارفی کو جنرل سکریٹری منتخب کیا ہے۔ساتھ ہی ایک تجویز منظور کر کے پروفیسر عبدالمغنی اور فخرالدین عارفی کو اس بات کا اختیار بھی دیا ہے کہ دونوں منتخب عہدہ دار جلد از جلد دیگر عہدہ داران اور ارکان عاملہ کے ناموں کا اعلان بھی کر دیں۔

(ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی، 30 جنوری۔ اردو اکادمی دہلی کی جانب سے لال قلعہ میدان میں مشاعرہ جشن جمہوریت کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت دہلی کی مشترکہ تہذیب کی علامت بزرگ شاعر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے ادا کیے۔ دہلی کے وزیر صحت منگت رام سنگھل نے شمع روشن کی اور راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیئرمین کے. رحمن خاں نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ مشاعرے میں گلزار دہلوی، وسیم بریلوی، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، عبدالاحد ساز، حیات لکھنوی، مخمور سعیدی، ولی بجنوری، پاپولر میرٹھی، رئیس انصاری، حق کانپوری، تابش مہدی، ظفر احمد نظامی، نسیم نکہت، وجیندر سنگھ پرواز، ملکہ نسیم، چرن سنگھ بشر، ساغر خیامی، نواز دیوبندی، شکیل اعظمی، نرمل سنگھ نرمل، شیاما سنگھ صبا، متین امروہوی، پرواز میرٹھی، آغا سروش، فرحت احساس، طاہر نقاش، شکیل حسن شمسی، مخدوم زادہ مختار عثمانی، رضا امروہوی، اقبال اشہر، اقبال فردوسی، انور باری، سیف سحری، اطہر شکیل نگینوی، ثاقب گنگوہی، شعیب مرزا اور کناڈا سے تشریف لائے مشہور ادیب و شاعر سید تقی عابدی نے اپنے کلام سے نوازا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● نئی دہلی، 28 جنوری۔ ''برطانوی حکومت سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے آزادی کی تحریک کے دوران اور آزادی کے بعد ملک کی تعمیر نو میں اردو شاعری اور اردو شاعروں کی خدمات بہت نمایاں رہی ہیں۔'' ان خیالات کا اظہار دھرم لال گپتا وفا کی یاد میں مدیر روزنامہ 'تیج' وشوبندھو گپتا کی رہائش گاہ پر منعقدہ ایک شعری نشست کا افتتاح کرتے ہوئے کانگریس کے سینئر لیڈر اور سابق گورنر اتر پردیش موتی لال ووہرا نے کیا۔ نشست کی نظامت رفعت سروش نے کی جس میں مخمور سعیدی، بیکل اتساہی، گلزار دہلوی، وسیم بریلوی، فصیح اکمل قادری، ڈاکٹر آفاق فاخری، ڈاکٹر شبانہ نذیر، عزم شاکری، کوثر صدیقی، عذرا نقوی، تابش مہدی، رمیش گپتا، ساغر خیامی اور پاپولر میرٹھی شریک ہوئے۔ وفا کی یاد میں یہ شعری نشست ہر سال منعقد کی جاتی ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

● چنئی، 25 جنوری۔ یوم جمہوریہ کے موقعے پر تمل ناڈو گورنمنٹ اردو اکیڈمی نے ایک مشاعرہ منعقد کیا جس کی صدارت اکیڈمی کے ممبر جناب اے محمود اشرف نے کی اور ایس فہیم احمد، اڈیشنل کمشنر کسٹم اور انکم ٹیکس مہمانِ خصوصی تھے۔ اس مشاعرے میں ڈاکٹر راہی فدائی، عتیق جاذب اور نثار الماس کے علاوہ برتر مدراسی، قادر ظہیر، اصغر ویلوری، ڈاکٹر صبا مصطفےٰ، مختار بدری، منیر نیازی، اسلم صدا، حسن فیاض، ڈاکٹر اعجاز کمال، ڈاکٹر عبید الرحمن احساس، مشاہد مدراسی، غافل، مظہر اشفاق، سجاد بخاری اور شہزاد آبرو نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے کی نظامت اکیڈمی کے اسسٹنٹ سکریٹری محمد امان اللہ نے کی اور اکیڈمی کے سکریٹری کے ایم. اشفاق الرحمن نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

تھکے نہ میرے پاؤں

● نوئیڈا، 12 جنوری۔ صبا اپارٹمنٹ میں ملک زادہ منظور احمد کی آمد پر ان کے استقبال میں اردو فاؤنڈیشن نے ایک جلسہ منعقد کیا، جس کی صدارت بھی ملک زادہ منظور احمد نے کی۔ جلسے میں رفعت سروش نے استقبالیہ کلمات کے ساتھ ان کی خودنوشت ''رقص شرر'' پر ایک مضمون پیش کیا۔ بعد ازاں مظہر امام اور گلزار دہلوی نے اس مضمون کے حوالے سے ملک زادہ کی شخصیت اور بالخصوص ان کے نثری اور شعری کارناموں کا ذکر کیا۔ اس کے بعد رفعت سروش کی نئی کتاب ''تھکے نہ میرے پاؤں'' کا اجرا ملک زادہ منظور احمد نے کیا۔

اس موقعے پر ڈاکٹر تابش مہدی نے کہا کہ ''تھکے نہ میرے پاؤں'' رفعت سروش کے نو اسفار کی سرگزشت ہے جو انھوں نے اپنی زندگی کے آخری تیس سال میں کیے۔ ان میں دو ایسے ممالک کی سرگزشت بھی ہے جو ان کے بہ قول اب ویسے نہیں ہیں جس طرح انھوں نے ان کو دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک سوویت یونین ہے اور دوسرا عراق۔ ''انھوں نے پاکستان کے سفرنامے ''یادوں کے چاند ستارے'' اور سعودی عرب کے سفرنامے ''لے چلا سوئے حرم مجھ کو مرا ذوقِ سجود'' کی خاص طور پر تعریف کی۔

مظہر امام نے کہا کہ نہ رفعت سروش تھکے ہیں، نہ ان کا قلم اور نہ ذہن۔ پی. پی. رندسری واستو نے اس کتاب پر مضمون پڑھتے ہوئے کہا کہ ان کا غیر رسمی سفرنامہ ''موت کا گلیارا'' اس سفر کی دلدوز روداد ہے جس میں ان کے پاؤں کٹ گئے تھے۔ بیماری کے بستر پر لیٹے لیٹے انھوں نے یہ سفرنامہ لکھ کر ثابت کر دیا کہ ''تھکے نہ میرے پاؤں۔''

بعد ازاں شعر و شاعری کا دور چلا جس میں بلراج ورما، راجندر شکل نچن، محمود انصاری، ملک زادہ جاوید، فصیح اکمل قادری، فاروق ارگلی، تابش مہدی، رند ساغری، مظہر امام، رفعت سروش، گلزار دہلوی اور ملک زادہ منظور احمد نے کلام سنایا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

کائنات نجم

● نئی دہلی، 21 جنوری۔ ''زمین کی تبدیلی قد آور درختوں کو راس نہیں آتی۔ ترک وطن سے جوش کی ہی طرح علامہ نجم آفندی کو بھی نقصان اٹھانا پڑا۔ علامہ نجم آفندی بیسویں صدی کے مرزا دبیر تھے۔ انھوں نے مرثیوں اور نوحوں کو ایک نئی جہت عطا کی اور نوحوں کو ملت کی بیداری اور انسان دوستی کا ذریعہ بنایا۔'' ان خیالات کا اظہار غالب اکیڈمی حضرت نظام الدین میں دہلی اردو اکادمی اور حدیث دل ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب بعنوان ''علامہ نجم آفندی: شخصیت اور شاعر'' میں مقررین نے کیا۔ اس موقع پر ساہتیہ اکادمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کناڈا میں مقیم معروف ادیب اور نقاد ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب ''کائنات نجم'' کا اجرا کیا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر قمر رئیس نے اور نظامت محمود نقوی نے کی۔ مقررین میں پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر گوپی چند نارنگ، خواجہ حسن ثانی نظامی، پروفیسر شارب ردولوی، پروفیسر سعد اللہ (تاشقند)، ڈاکٹر خلیل الرحمن، ڈاکٹر عظیم اختر اور ڈاکٹر عباس رضا نیر شامل تھے۔ پروگرام کے آغاز میں دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے نعت شریف اور علامہ نجم آفندی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

آسان اردو قواعد

● حیدرآباد۔ دکن لٹریری ایسوسی ایشن اور ادارہ ماہنامہ ''رنگ و بو'' کی جانب سے ڈاکٹر م۔ق۔ سلیم کی کتاب ''آسان اردو قواعد'' کے ساتویں ایڈیشن کی اشاعت پر جناب مجتبیٰ فہیم مدیر ''رنگ و بو'' کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں جناب اطیب اعجاز، جناب شاہ نواز شاہ نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ جناب مجتبیٰ فہیم نے کتاب کا اجرا کیا۔ انھوں نے کہا کہ آج کل بچوں کا ادب کم ہی نظر آ رہا ہے ایسے دور میں ڈاکٹر م۔ق۔ سلیم کی کتاب ''آسان اردو قواعد'' کا یہ ایڈیشن آنا قابل تعریف ہے اور اس سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ جناب اطیب اعجاز نے کہا کہ یہ کتاب اپنی انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ جلسے میں جناب محمد علیم

انجینئر محمود الحسن، شاہ نواز شاہ نے بھی خطاب کیا اور جناب محمد مصباح الدین نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

دربھنگہ ٹائمس

● دربھنگہ۔ اردو اخبار اور رسالے کو خرید کر پڑھنا ہی زبان و ادب کے تئیں سچی محبت کا ثبوت ہے۔ پروفیسر رئیس انور (صدر شعبۂ اردو ایل۔ این۔ متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ) نے پندرہ روزہ اخبار ''دربھنگہ ٹائمس'' کے اجرا کے موقعے پر اس خیال کا اظہار کیا۔ ادبی پارلیمنٹ کی جانب سے اس پروگرام میں معروف شاعر جناب عبدالمنان طرزی کے ہاتھوں ''دربھنگہ ٹائمس'' کا اجرا ہوا انھوں نے نوجوان مدیران منصور خوشتر اور نظر عالم کو مبارکباد پیش کی۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر عبدالوہاب تھے اور بزرگ شاعر جناب حسن امام درد نے جلسے کی صدارت کی۔ انھوں نے ''دربھنگہ ٹائمس'' کے مشمولات پر بھی روشنی ڈالی اور بعض مشورے بھی دیے۔ نظامت نوجوان شاعر عبدالودود قاسمی نے کی۔ جلسے میں مولانا فاروق احمد ندوی، ڈاکٹر مشتاق احمد، عطا عابدی، ڈاکٹر نور محمد عاجز، علاء الدین حیدر وارثی، ڈاکٹر شمیم احمد باروی، عطاء الرحمن رضوی، انجینئر خورشید عالم، فردوس علی اور وصال احمد نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

(ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

مولانا اسعد مدنی

● نئی دہلی، 6 فروری۔ جمعیۃ علما ہند کے صدر مولانا اسعد مدنی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ 78 برس کے تھے۔ مرحوم کے پسماندگان میں 2 بیٹیاں اور مولانا محمود مدنی سمیت چار بیٹے ہیں۔ مولانا اسعد مدنی گذشتہ تین ماہ سے دہلی کے اپولو اسپتال میں زیر علاج تھے جہاں 6 فروری کو بعد نماز مغرب انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم آخری دم تک ملت اسلامیہ کی بہبود کی کوششوں میں لگے رہے۔ وہ 27 اپریل 1928 کو دیوبند میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اسلامی دینیات میں فضیلت حاصل کی تھی۔ 19 اگست 1963 کو وہ جمعیۃ کے ناظم عمومی مقرر ہوئے، جب کہ 11 اگست 1973 کو مذکورہ تنظیم کے صدر منتخب ہوئے۔ وہ کانگریس ورکنگ کمیٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ، رابطہ عالم اسلامی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور ہمدرد ٹرسٹ دہلی، مرکزی حج کمیٹی دہلی سمیت کئی اداروں اور تنظیموں سے وابستہ تھے۔ انھوں نے بحیثیت راجیہ سبھا رکن ملکی سیاست میں اہم کردار نبھایا۔ انھوں نے 42 برسوں تک جمعیۃ علما کو اپنی خدمات پیش کیں اور برادران ملت کی فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ وہ ملک کی سیاست میں بھی مسلمانوں کو واجب حق دلانے کے لیے پیش پیش رہے۔ مولانا مدنی بیرون ملک بھی کافی مقبول تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر برطانیہ، بنگلہ دیش اور پاکستان سمیت دیگر ممالک میں متعدد کانفرنسوں کو بھی خطاب کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

نورالحسن نقوی

● نئی دہلی، 25 جنوری۔ اردو کے نامور محقق، نقاد اور تقریباً ڈیڑھ سو کتابوں کے مصنف پروفیسر نورالحسن نقوی کا نئی دہلی کے گنگا رام اسپتال میں طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ کینسر کے مرض میں مبتلا تھے۔ ان کی عمر 74 سال تھی۔ ان کا تعلق امروہہ کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ اوائل عمر میں وہ بغرض روزگار دہلی آگئے تھے اور فتح پوری مسلم سکنڈری اسکول میں ملازم ہو گئے۔ اس دوران انھوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور اردو ادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو سے بحیثیت لیکچرر وابستہ ہو گئے اور چند برسوں بعد پروفیسر ہو گئے جہاں سے وہ 1998 میں سبک دوش ہوئے۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ، تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔

پروفیسر نورالحسن نقوی کے سانحۂ ارتحال پر فیکلٹی آف آرٹس لاؤنج میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی صدارت میں منعقد تعزیتی جلسے میں شعبے کے صدر پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر محمد زاہد، پروفیسر سید محمد امین، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر مسعود عالم اور ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری نے ان کی ادبی اور سماجی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی نے تعزیتی قرار داد پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ مقبول ہی نہیں بلکہ محبوب استاد تھے۔ سرسید، مصحفی، غالب اور اقبال پر ان کی تصانیف علمی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئیں۔ ان کی ایک درجن ادبی، تحقیقی اور تنقیدی کتابوں کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ کلیات مصحفی کی آٹھ جلدیں، دیوان قصائد، کلیات جرأت، دیوان غالب، اردو لغت اور فکر و نظر کے خصوصی شمارے نامور ان علی گڑھ کی ترتیب و تدوین ان کی اہم علمی خدمات ہیں۔ وہ الفاظ، فکر و نظر، تہذیب الاخلاق اور خبر و نظر علی گڑھ کے مدیر، یونیورسٹی پبلیکیشنز کے ممبر انچارج، ذاکر حسین ہائر سیکنڈری اسکول کے بانی اور منیجر تھے۔

□□□

تبصرہ و تعارف

نظیر اکبرآبادی کی جمالیات/شکیل الرحمٰن
صفحات: 80، قیمت: -/42 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر.کے. پورم، نئی دہلی۔110066
مبصر: عبید الرحمٰن

''نظیر اکبرآبادی کی جمالیات'' پروفیسر شکیل الرحمٰن کی تازہ کتاب ہے۔ نظیر کا واسطہ عوامی زندگی سے بہت قریب کا رہا۔ ان کا تعلق ہندو، مسلمان، امیر و غریب، غرض ہر طرح کے لوگوں سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں تمام مذاہب کی رسومات اور تہواروں کا دلچسپ بیان ملتا ہے۔ یعنی وہ ہندوستان کی گنگا جمنی مشترکہ تہذیب کی مکمل تصویر تھے۔ لہٰذا اس شاعر کے کلام میں جمالیاتی پہلوؤں کی ایک دنیا آباد ہے جس تک شکیل الرحمٰن نے رسائی حاصل کر کے نئے گوشوں اور نئی جہتوں کی نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے اس حقیقت پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ نظیر جیسے وسیع النظر اور قادرالکلام شاعر کو تذکرہ نویسوں اور نقادوں نے اعتبار نہیں بخشا اور ان کی زبان کو مستند تسلیم نہیں کیا۔ حالاں کہ اردو کے کسی دوسرے شاعر نے اتنے زیادہ الفاظ استعمال نہیں کیے جتنے نظیر نے کیے۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر کو ایک ادبی روایت کی حیثیت حاصل ہے جس سے بعد کے ادبا و شعرا بھی متاثر نظر آتے ہیں اور ان کی تخلیقات پر اسی ڈکشن اور اسلوب کا عکس نظر آتا ہے۔

نظیر کے مزاج اور رجحان کی پہچان کے حوالے سے جن نظموں کا ذکر شامل ہے ان میں بہار، چاندنی، برسات کا تماشا، برسات کی بہاریں، جاڑے کی بہاریں، شب برأت، عید، بسنت، ہولی، دیوالی، راکھی، بلدیو جی کا میلہ، کبوتر بازی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس کتاب میں نظیر کو چوں کہ جشن زندگی کے ایک بڑے شاعر کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اس لیے مصنف نے انھیں سات رنگوں کے شاعر سے منسوب کیا ہے اور ہر رنگ کی نمائندہ نظموں سے بحث کی ہے۔ زندگی کے جمال و جلال کے رنگ کی گفتگو میں بہار، چاندنی، برسات اور آندھی جیسی نظموں کا ذکر آیا ہے تو عشق و محبت کے جمال کے رنگ میں سوز فراق، طلسم وصال، ملاقاتِ یار، جوشِ جنوں، خواب کا طلسم جیسی نظموں کا بیان ہے۔ معاشرے کے جمال کے رنگ کے ضمن میں بانسری، شب برأت، بسنت، ہولی، دیوالی، راکھی وغیرہ نظمیں شامل کی گئی ہیں تو مذہب اور تصوف کے چوتھے دلکش رنگ میں حمد، نعت، منقبت، مدح اولیا، فقیروں کی صدا، بنجارہ نامہ، رہے نام اللہ کا، توحید تسلیم و رضا، زندگی اور موت، توکل، فنا، وجود حال، کلجگ اور چڑیوں کی تسبیح کا تذکرہ ہے۔ وقت اور لمحوں کو عمر کے مدارج کے طور پر پیش کرنے والی نظموں میں طفلی، جوانی، بڑھاپا، موت کا دھڑکا وغیرہ شامل ہیں۔ جنم کنہیا جی، درگا جی کے درشن، تعریف بھیروں کی، مہادیو جی کا بیاہ، کنہیا جی کی راس جیسی نظموں کو دیو مالا اور روایتی کہانیوں کے ذیل میں رکھا گیا ہے۔ ساتویں رنگ کی پہچان حکایات میں ہوتی ہے جس کے تحت ہنس، کوے اور ہرن کی دوستی، قصۂ لیلیٰ مجنوں وغیرہ کے نام شامل کیے گئے ہیں۔

صاحب کتاب نے نظیر کی زبان پر دسترس، الفاظ کے انتخاب میں فن کاری، روایتوں کی پاسداری، ڈکشن اور اسلوب کے معیار پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ شکیل الرحمٰن نے نظیر کے کلام کا جس نہج سے مطالعہ پیش کیا ہے وہ یقیناً نظیر کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ یہاں نظیر کی نظموں کی اس خوبی کی طرف بڑے واضح اشارے ملتے ہیں جہاں نظم میں جاری ایک تصویر جو لطف و انبساط کا اشاریہ ہے اچانک کیسے ایک ایسی تصویر میں بدل جاتی ہے جو غم انگیز ہے۔ بہ یک وقت مسرت بخش اور غم انگیز شاعری اپنے آپ میں ایک نیا جادو ہے جس کے اثر سے قاری باہر نہیں آپاتا۔ شکیل الرحمٰن نے اس نئے جادو کی تہیں کھول کر رکھ دی ہیں۔ کلام کے اندر داخلی سچائی کا ثبوت 'آدمی نامہ' اور 'خوشامد' سے فراہم کیا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں نظیر اکبرآبادی کی نظم 'آئینہ' دی گئی ہے اور ساتھ ہی اس کے حسن اور معنویت سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ نظم انسان کے وجود کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے۔

●

نام کتاب: حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات
مصنف: سید ممتاز مہدی
صفحات: 428، قیمت: -/92 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، ونگ۔6، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066
مبصر: سراج نقوی

زیر تبصرہ کتاب چار ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا باب ''ادب اور صحافت'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں مصنف نے مختلف ادیبوں اور نقادوں کے حوالے سے ادب اور صحافت کی تعریف بیان کی ہے۔ ان میں ڈاکٹر سید عبداللہ، شارب ردولوی، میر حسین، ڈاکٹر وحید، ڈاکٹر محمد افضل الدین، عابد صدیقی، عتیق صدیقی اور محمد نورالدین کی آرا پیش کی گئی ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کئی آرا آج کے بدلتے ہوئے صحافتی معیار اور ادب وصحافت سے قریب تر ہوتے ہوئے رشتوں کے سبب درست قرار نہیں دی جاسکتیں۔ علاوہ ازیں تین ذیلی عنوانات ''وقائع نویسی سے صحافت تک کا سفر''، ''جمہوری دور میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت اور ضرورت'' اور ''روز ناموں کے تصور'' کے تحت مذکورہ موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ ''اردو کا پہلا روز نامہ'' دوسرے باب کا موضوع ہے۔ جس میں مصنف نے مع حوالہ جات یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اردو کا پہلا روز نامہ منشی نول کشور کی ادارت میں لکھنؤ سے شائع ہونے والا ''اودھ اخبار'' تھا جو 1858 میں شروع ہوا تھا اور 1874 میں اس نے روزنامے کی شکل اختیار کر لی اور باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ باب کے آخر میں مصنف نے حیدرآباد کے نمایاں اردو روزناموں کے مشمولات، مستقل کالم، کالم نگار، اخبار کی خدمات اور اس کی تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ جن اخبارات کو اس باب میں شامل کیا گیا ہے ان میں 'رہنمائے دکن' سرفہرست ہے۔ اخبار کے مستقل کالموں میں لکھنے والوں کے ناموں کی فہرست بھی اس میں شامل ہے۔ اس میں مضمون نگاروں، شاعروں اور ادیبوں کے نام اور ان کی تصنیفات کے نام بھی شامل ہیں۔ اردو روز ناموں سیاست، ملاپ اور منصف کے مشمولات اور دیگر تفصیلات کو کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

چوتھا باب حیدرآباد کے اردو روز ناموں کے مدیران کے انٹرویو اور ان کے تاثرات پر مشتمل ہے۔ اس میں سید محمود وحید الدین (سابق مدیر ''رہنمائے دکن'')، سید وقار الدین (موجودہ مدیر ''رہنمائے دکن'') اختر حسن (مدیر ''پیام، دعوت'')، مسٹر عابد علی اور محبوب حسین جگر (مدیران سیاست)، شری یدھ ویر (مدیر ''ملاپ'') محمود انصاری (مدیر ''منصف'')، اظہار افسر، وقار خلیل اور ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال کے انٹرویو اور تاثرات کو شامل کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب حیدرآباد کے اردو روز ناموں کی ادبی خدمات سے متعلق مفید معلومات فراہم کرتی ہے۔ امید ہے کہ قومی اردو کونسل کی دیگر مطبوعات کی طرح اسے بھی پسند کیا جائے گا۔

●

نام کتاب: شہد کی مکھی اور نحل کاری
مصنف: ڈاکٹر محمد نعیم
صفحات: 104، قیمت: -/17 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066
مبصر: بسمل عارفی

شہد کی مکھی اور نحل کاری کی تاریخ ہندوستان میں تقریباً 125 سال پرانی ہے۔ 1880 میں جان ڈگلس اور لوئس ڈاوے نے ہماچل پردیش کے کولو علاقے میں شہد کی مکھیوں کو بکس میں رکھ کر پالنے کی ترکیب ایجاد کی تھی۔ عوام تک اس ترکیب کی رسائی نہ ہونے کی وجہ سے یہ چلن عام نہ ہوسکا۔ اس کے نصف صدی بعد جب 1930 میں ڈاکٹر گھوش نے پوسا (بہار) میں دوران تحقیق شہد کی مکھیوں کی زندگی کے مختلف مدارج کے بارے میں عوام کو معلومات فراہم کیں تو شہد کی مکھیوں کو پالنے کا رواج عام ہوگیا اور اب تو یہ باقاعدہ ایک روزگار کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت شہد کی مکھی سے متعلق چھوٹے چھوٹے مختلف مضامین شامل ہیں جن میں ''شہد کی مکھی۔ تاریخ کے آئینے میں''، ''شہد کی مکھی اور اس کی کالونی''، ''شہد کی مکھیوں کی چند غیر معمولی خصوصیات''، ''ہندوستانی شہد کی مکھیوں کی قسمیں''، ''نحل کالونی کی قسمیں نگرانی اور پرورش''، نحل کالونی کی نسل، افزائش اور نحل کاری کے ساز وسامان ''نحل'' کاری کے فوائد ''نحل'' کاری اور زراعت ''نحل کے امراض اور ضرر رساں پرند''، ''شہد کی مکھی اور حشرہ کش دوائیں'' علاوہ ازیں بعض ذیلی عنوانات کے تحت مشمولہ مضامین سے متعلق مزید معلومات فراہم کی گئی ہے۔

شہد کی مکھیوں کے لیے موسم بہار یعنی فروری اور مارچ کے مہینے اہم ہوتے ہیں جن میں ان کی افزائش ہوتی ہے۔ شمالی ہند کے میدانی حصوں میں فروری مارچ کے علاوہ ستمبر اور اکتوبر کے مہینے بھی ان کے لیے مناسب ہیں۔ شہد کی مکھی اپنی غذا پھولوں سے حاصل کرتی ہے مگر اس سے پھولوں کا نقصان نہیں ہوتا۔ مکھیاں پھولوں کا رس اپنے شہد کی تھیلی میں جمع کرکے اڑ جاتی ہیں جو اڑان کے دوران ہی شہد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

''شہد کی مکھی اور نحل کاری'' کے مطالعے سے نہ صرف شہد کی مکھی کے

اقسام اور ان کے طرز رہائش و اطوار سے واقفیت حاصل ہوتی ہے بلکہ انھیں پالنے کے طور طریقوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ مشمولہ مضامین میں سائنسی نقطۂ نظر کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے تاکہ قارئین کسی الجھن کا شکار نہ ہوں۔ تفصیل سے قطع نظر یہ کتاب شہد کی مکھی اور مگس کاری سے متعلق معلومات کا خزانہ ہے۔

●

کتنے پاکستان (ناول) کملیشور
مترجم: خورشید عالم
صفحات: 380، قیمت: -/350 روپے
ناشر: مکتبۂ استعارہ، 248، غفار اپارٹمنٹس، غفار منزل ایکسٹینشن، استعارہ لین، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110 025
مبصر: فیروز عالم

ہندی زبان کے ممتاز ناول نگار کملیشور کا یہ ناول نہ صرف ہیئت و اسلوب کے اعتبار سے منفرد ہے بلکہ موضوع اور مواد کے اعتبار سے بھی ندرت بیانی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار 'وقت' ہے جو ابتدا سے انتہا تک انسان کے سچ اور جھوٹ، صحیح اور غلط کا چشم دید گواہ ہے۔

آج پوری دنیا میں افراتفری اور قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ کہیں مذہب کے نام پر فساد ہو رہا ہے، کہیں علاقے کے نام پر اور کہیں نسل اور رنگ کے نام پر۔ آج دلوں کو جوڑنے والے افراد گنتی کے رہ گئے ہیں اور تقسیم کرنے والوں کی تعداد روز افزوں ہے۔ ایسے میں سیاست داں بھی اپنی ذمے داری نہیں نبھا رہے ہیں۔ ان حالات میں صرف ادبا ہی اپنی ذمے داریوں کو محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن یہ ادیب بھی دنیا کے ان لاتعداد انسانوں کی طرح خانماں برباد بن گئے ہیں جن کا سب کچھ لٹ چکا ہے۔ ''چھوٹے چھوٹے سفید خیموں کی ایک بستی سامنے موجود تھی۔ اس بستی پر ریت کے وہی سفید پرندے اڑ رہے تھے۔ ادیب دوڑتا دوڑتا وہاں پہنچا تو سکتے میں آ گیا... اپنے اپنے خیموں میں سبھی تو موجود تھے۔

کبیر، ٹالسٹائے، ٹیگور، اغنان، کزانتی زاکس، راہل سانکرتیاین، ڈکنز، چیخوف، کامیو، پریم چند، میلان کنڈیرا، بریخت، نرالا، سارتر، ہزاری پرساد دویدی، میر، سودا، غالب، فیضی، نظامی، منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، دشینت کمار، رینو، راکیش، رگھو بیر سہائے، پرسائی، شری کانت، مکتی بودھ، وہ تو سب کو پہچانتا تھا۔ مہاجرین کے طور پر ادیب اپنے اپنے خیموں میں موجود تھے۔''

''کتنے پاکستان'' میں ماضی اور حال ایک ساتھ موجود ہیں اور ادیب عدالتی انداز میں مظلومین کی فریاد سن رہا ہے۔ اس عدالت کا عملہ صرف ادیب اور اس کے اردلی محمود علی پر مشتمل ہے جو بابر، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب، دارا شکوہ، گاندھی جی، محمد علی جناح، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ان جیسی لاتعداد شخصیات کو اس عدالت میں پیش کرتا ہے جو اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔

اس ناول میں لفظ 'پاکستان' پوری دنیا میں جاری علاحدگی پسندی کی تحریکوں کے استعارے کے طور پر مستعمل ہے۔ یہاں پر چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''دنیا کے سارے پاکستانوں کے باشندے اپنی ہی قوم کے باشندوں کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔'' (ص۔106) ''اس بار تو سرب اور کروٹ عیسائیوں نے اپنے ہی ملک کے مسلمانوں کو اپنا پاکستان بنانے پر مجبور کیا ہے! ان کا حقہ پانی بند کر دیا ہے!'' (ص۔198)

''پاکستان سے پاکستان پیدا ہوتا ہے..... یہ چھوت کی ایک بیماری ہے۔ جب تک مذہب، نسل، ذات اور دنیا کی پہلی طاقت بننے کا نشہ نہیں ٹوٹتا، جب تک اقتدار اور برتری کی ہوس نہیں ٹوٹتی تب تک اس زمین پر پاکستان بنائے جانے کی مہلک روایت جاری رہے گی.....'' (ص۔205)

تاریخ عالم میں ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ ہے جس نے لاکھوں لوگوں کو اپنا وطن عزیز اور اعزا و اقارب کو چھوڑ کر ایک اجنبی سرزمین پر بود و باش اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' تقسیم ملک کے چار پانچ برس بعد کے حالات و واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ ''کتنے پاکستان'' میں اس کے بعد کی صورت حال واضح طور پر نمایاں ہے جبکہ کملیشور نے اس ناول میں تقسیم وطن کے بطن سے پیدا ہونے والی مختلف اور مزید تقسیموں کو موضوع بنایا ہے۔ تفصیل سے قطع نظر کملیشور کے اس ناول میں عالمی سطح پر جبر و استحصال اور علاحدگی پسندی کو بطور خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستان میں آریوں کی آمد، مسلمانوں کی حکومت، انگریزوں کا عہد اور تقسیم ملک سے لے کر عصر حاضر تک کی پوری ہندوستانی تاریخ وقفے وقفے سے قاری کے سامنے آتی ہے اور ناول نگار تاریخی صداقتوں سے پردہ اٹھاتا جاتا ہے جنھیں سیاسی مصلحت پسندوں نے پردۂ خفا میں رکھا تھا۔

ناول نگار نے تاریخی حوالے سے بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعے پر بھی روشنی ڈالی ہے جس نے ہمارے ملک کی صدیوں پرانی فرقہ وارانہ ہم آہنگی، رواداری اور مشترکہ تہذیب کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ فرقہ پرست سیاست نے یہ تصور عام کیا کہ بابر نے ایودھیا میں رام مندر کو مسمار کر کے بابری مسجد کی تعمیر کرائی تھی۔ بابر کی زبانی اس حقیقت کو ملاحظہ کیجیے:

''آگرہ میری راجدھانی تھی۔ اس وقت ہندوؤں کے کرشن کو بھگوان اور اوتار قبول کیا جا چکا تھا۔ ان کی جائے پیدائش متھرا میں تھی۔ میری

راجدھانی آگرے سے صرف پچاس میل دور...... اگر مجھے توڑنا ہی ہوتا تو میں کرشن کی جائے پیدائش توڑتا؟ بھاگا بھاگا ایودھیا تک جاکر رام کی جائے پیدائش کیوں توڑتا؟ کیونکہ رام تو بھگوان ہوئے تلسی داس کے بعد اور میرے سامنے تلسی داس بچہ تھا۔ اس نے رامائن میرے مرنے کے بعد لکھی۔" (ص۔85)

ادیب کی عدالت میں حاضر ہوکر سلطنت برطانیہ کے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کا ڈائرکٹر جنرل اے۔ فیوہرر بتاتا ہے کہ "930ہجری یعنی 17 ستمبر 1523 کو ابراہیم لودھی نے اس مسجد کی بنیاد رکھوائی تھی۔ 10 ستمبر 1524 کو بن کر تیار ہوئی جسے اب بابری مسجد کہا جاتا ہے۔" (ص۔86)

انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کے لیے ایک سازش کے تحت اس مسجد کے کتبے کو مٹا دیا اور "بابر نامہ" کے ان اوراق کو بھی غائب کر دیا گیا جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ بابر کبھی ایودھیا گیا ہی نہیں۔ انگریز مورخ ایچ۔ آر۔ نیول نے فیض آباد گزیٹیر میں ہندو مسلم منافرت پیدا کرنے کے لیے لکھا کہ بابر ایودھیا میں ایک ہفتے ٹھہرا اور اسی نے قدیم رام مندر کو مسمار کیا۔ انگریزوں نے مسجد کا کتبہ مٹا دیا لیکن آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا میں درج اس کا ترجمہ نہ مٹا سکے اور نہ "ہمایوں نامہ" کے ان صفحات پر ان کی نگاہ پڑی جو یہ شہادت دیتے ہیں کہ 2 اپریل 1528 سے 18 ستمبر 1528 کے درمیان بابر آگرے میں اپنی بیوی اور بیٹی کے ہمراہ تھا جبکہ ایچ۔ آر۔ نیول نے مسجد کی تعمیر کا بھی یہی وقت تحریر کیا ہے۔

کملیشور نے نہ صرف اس پوری سازش کو بے نقاب کیا ہے جو ہزاروں بے گناہوں کی موت کا سبب بنی بلکہ انگریزوں کے ذریعے مذہب اور زبان کے نام پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو تقسیم کرنے کی سازش کو مع تاریخی حقائق پیش کیا ہے۔

"کتنے پاکستان" میں مہابھارت سے لے کر ہیروشیما اور ناگا ساکی پر بمباری، بنگلہ دیش کا قیام، کشمیر میں دہشت گردی، عراق، افغانستان پر امریکی حملہ، بوسنیا میں مسلمانوں کا قتل عام اور موجودہ دور میں وقوع پذیر ہونے والے ان لاتعداد واقعات و حادثات کا ذکر کیا گیا ہے جو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔ آج اقوام متحدہ کا وجود بے معنی ہوکر رہ گیا ہے۔ اس تنظیم کے قیام کا مقصد امن عالم کا استحکام تھا لیکن آج یہ تنظیم امریکہ کی کٹھ پتلی بنی ہوئی ہے۔ امریکہ جس ملک کو چاہتا ہے دہشت گرد قرار دے کر اس پر اقتصادی پابندیاں عائد کرا دیتا ہے یا اس پر حملہ کر کے وہاں اپنی پسند کی حکومت قائم کر دیتا ہے۔ اور اس مکروہ عمل کو جمہوریت کی بحالی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کے جنرل سکریٹری کوفی عنان اس یک قطبی طاقت کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں۔ امریکہ اور اس کے حواریوں کی عیاریاں اور مکاریاں ملاحظہ کیجیے:

"ادیب عالی! قابو میں کر کے روحوں کو توڑا جاتا ہے...... پھر انھیں تقسیم کیا جاتا ہے...... ان میں ثقافتی دفاع کی طاقت کو شکستہ کیا جاتا ہے اور تب بازار پرست جونکیں اس تقسیم شدہ قوم کا سارا خون چوس لیتی ہیں۔ شکستہ تمدن کے شمشانوں میں تب جشن کے بازار قائم ہوتے ہیں...... مذہب اور تاریخ کا استحصال کرنے والوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر ناچتے گاتے، جشن مناتے اپنے ہی تقسیم شدہ حصے کے دشمن اور اپنی تباہی کا سبب بن جاتے ہیں...... بڑی تہذیبوں کو توڑ کر انھیں قیدی بنانے کے لیے تقسیم کا یہی راستہ ان غیر مہذب اور بدتہذیبوں نے چنا ہے۔" (ص۔61)

اس نفرت کی آندھی کو روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے...... عدم تشدد، اس کے لیے کملیشور بودھی ورکش لگانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ناول میں کبیر داس اس کا آغاز پوکھرن اور چاغی سے کرتے ہیں جہاں ہندوستان اور پاکستان نے 1999 میں ایٹمی دھماکے کیے تھے جو برصغیر میں کشیدگی کا باعث بنے۔

انتظار حسین نے لکھا تھا "کہانیاں کہتے رہو کہ لوگ کچھ تو سوچ وچار کریں۔" کملیشور کا یہ ناول نہ صرف غور وفکر بلکہ عمل کی بھی دعوت دیتا ہے۔ کملیشور نے ناول کے طرز میں جن تاریخی حقائق کو مع حوالہ جات پیش کیا ہے۔ یہ انھی کا حصہ ہے اور ان کی قوت بیانی پر دال ہے۔ ان کی یہ تکنیک انھیں اپنے معاصرین میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ ناول کے مترجم ڈاکٹر خورشید عالم مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے "کتنے پاکستان" کو اردو کا قالب اس خوبی سے عطا کیا ہے کہ یہ اردو ہی کا ناول معلوم ہوتا ہے۔ اس معیاری اشاعت پر ناشر، مصنف اور مترجم مبارکباد کے مستحق ہیں۔

●

حرف آبدیدہ/رزاق افسر
صفحات: 304، قیمت 250 روپے
ناشر: بزم اردو، حیدر علی روڈ، لشکر محلہ، میسور۔ 570007
مبصر: احمد کفیل

"حرف آبدیدہ" رزاق افسر کا چوتھا شعری مجموعہ ہے جس میں 1951 سے 2004 کے درمیان رحلت کرنے والی اہم شخصیات کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اس سے قبل ان کے تین مجموعہ ہائے کلام ---- "آبشار" (1980)، "اعتراف" (1990) اور "شب چراغ" (1998) شائع ہو چکے ہیں۔ "حرف آبدیدہ" میں شاعر نے بین الاقوامی ادبی، قومی، سماجی اور

مذہبی شخصیات کے سانحۂ ارتحال پر اپنے تاثرات کا اظہار منظوم پیرائے میں کیا ہے جو تاریخی قطعات کی توسیعی شکل ہیں۔ رزاق افسر کی بیشتر شخصیات سے والہانہ وابستگی رہی ہے اس کے باوجود ان کے یہاں اعتدال قائم ہے جو ایک بڑی بات ہے۔

"حرف آبدیدہ" تین ابواب میں منقسم ہے۔ باب اول— "بھارت تالندن" میں بین الاقوامی سطح کے 81 اہم ادبا و شعرا، سیاسی، مذہبی اور سماجی شخصیات کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں ادبا و شعرا کے ذیل میں فیض احمد فیض، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، مجنوں گورکھپوری، سیماب اکبرآبادی، راجندر سنگھ بیدی، حفیظ جالندھری، حفیظ میرٹھی، احمد جمال پاشا، خلیل الرحمٰن اعظمی، حسن نعیم، ظ. انصاری، شاذ تمکنت، عمیق حنفی، پروین شاکر، آل احمد سرور، علی سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، مالک رام، اور کالی داس گپتا رضا وغیرہ کے نام ہیں۔ سماجی و مذہبی شخصیات میں مجاہد الاسلام قاسمی، علی میاں ندوی، حکیم عبدالحمید، مدر ٹریسا، امام خمینی، قاری محمد طیب اور پوپ جان پال اور سیاسی شخصیات میں اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، شہزادی ڈائنا اور راجا سندھیا کے نام تعزیتی قطعات پیش کیے گئے ہیں۔

باب دوم— "شعرائے کرناٹک" میں 45 اہل قلم شامل ہیں جن میں چند نام اس طرح ہیں: محمود ایاز، حمید الماس، وزیر عرشی، ضمیر عاقل، سلیمان خطیب، پیراں شاہ قادری، اسمٰعیل تابش، علیم صبا نویدی، سلیم ہاشمی، فضا کوثری، عطا اللہ چشتی اور خلیل سیمابی وغیرہ۔ باب سوم— "میرے اپنے" میں 21 مرحومین پر تاریخی اور تعزیتی قطعات قلم بند کیے گئے ہیں۔ رزاق افسر نے اپنے رشتے داروں اور اہل خاندان کے علاوہ اپنے خاص احباب کا بھی ذکر کیا ہے جن میں پروفیسر عنوان چشتی، رام پرکاش راہی اور فیض اللہ خاں فیض وغیرہ شامل ہیں۔ ترتیب میں نمبر 4 سے 6 تک کے عنوانات — مرحومین عزیز و اقارب، کرناٹک کے مقتدر ارباب ادب اور برصغیر کے ممتاز شعرا و ادبا ایک الگ باب کے متقاضی تھے کیوں کہ ان ذیلی عنوانات میں شامل معروف وغیر معروف شخصیات کی صرف آمد و رخصت کی تاریخ اور ان کی تصانیف کا اشاریہ ہے۔ ان ذیلی عنوانات کے تحت اعزا و اقارب میں 50 شخصیات، کرناٹک کے ارباب ادب میں 46 شخصیات اور برصغیر کے ممتاز ادبا و شعرا میں 131 شخصیات شامل ہیں۔ کتاب کے آخری چند صفحات میں شکریہ نامہ اور مخلصین کی فہرست درج ہے۔

ایک شاعر کی حیثیت سے رزاق افسر کو ملک گیر شہرت حاصل ہے۔ اپنی پیرانہ سالی اور خرابیِ صحت کے باوجود آج بھی میسور میں "بزم اردو" کی سرگرمیاں انھی کے دم سے قائم ہیں۔ "حرف آبدیدہ" میں شامل دو سو تاریخی و تعزیتی قطعات میں ان کی شاعرانہ ہنرمندی قابل داد ہے۔ ان کے مطالعے سے متعلقہ شخصیات سے متعلق معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ رحلت کے ساتھ ساتھ بیشتر شخصیات کا سنہ ولادت اور تصاویر بھی کتاب کو دستاویزی حیثیت عطا کرتی ہیں۔

کتاب کے ابتدائی صفحات میں — "حرف آبدیدہ پر ایک نظر" "پیش گفتار"، "دیباچہ" اور "بیاں اپنا" کے تحت بالترتیب ضیا میر، سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر اسلم پرویز اور خود رزاق افسر نے کتاب کی غرض و غایت اور اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ مجموعہ طلبہ، اساتذہ اور محققین کے علاوہ کتب خانوں اور تعلیمی و تحقیقی مراکز کے لیے ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

□□□

تیز تر اور دور تر (نقل و حمل کی کہانی)

مصنف: میر نجابت علی / مترجم: مہ جبیں اختر

نقل و حمل انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ پیٹ بھرنے سے لے کر مختلف افراد سے ملنے اور دیگر ضروریات کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا انسان کا شوق بھی ہے اور مجبوری بھی۔ زیر نظر کتاب میں ذرائع نقل و حمل کے مسلسل ارتقائی سفر سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 82، قیمت: 28 روپے

جنگلات کی کاشت

مصنف: ایس. کونداس / مترجم: مسرت جہاں

جنگل ہمارے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی ندیاں، پہاڑ اور دیگر قدرتی اشیا۔ یہ نہ صرف ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں معاون ہیں بلکہ کئی اہم صنعتوں کا دارومدار بھی ان پر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف جنگلی درختوں اور جنگل سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/24 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

بچوں کا گوشہ

مصنف: محمد قاسم صدیقی

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انہیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب "بھارت کی لوک کتھائیں" (حصہ دوم) سے ایک کہانی پیش کی جا رہی ہے۔ہندوستان قصے کہانیوں کا ملک ہے۔ دیو مالائی اور ما فوق الفطرت کہانیاں جتنی ہمارے پاس ہیں، شاید ہی کسی اور ملک میں ہوں۔ "بھارت کی لوک کتھائیں" میں اٹھارہ دلچسپ کہانیاں پیش کی گئی ہیں جو بچوں کے ساتھ بڑوں کو بھی پسند آئیں گی۔ چند کہانیوں کے عنوانات یہ ہیں: بلی اور گدھ، بندر اور ریچھ، لومڑی کا انصاف، کچھوا اور تالاب، مور کے خوبصورت پر، بلبل اور ہاتھی، چالاک گیدڑ، برائی کا انجام برا، سانپ اور مینڈک ، شیر اور کسان وغیرہ۔80صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/12روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

اُلّو کی اُداسی

کیا آپ نے کبھی اُلّو دیکھا ہے؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ اُلّو اس قدر غمگین اور اداس کیوں دکھائی دیتا ہے؟ سب جانتے ہیں کہ اُلّو اپنی عقلمندی کے لیے بہت مشہور ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں جب برگد کے درخت نہیں تھے، ایک دن اُلّو نے زمین پر برگد کی ایک ننھی سی کونپل پھوٹتی دیکھی، دوسری چڑیوں نے بھی اس ننھے سے پودے کو دیکھا۔ انھوں نے اسے کوئی اہمیت نہ دی مگر اُلّو ان چڑیوں سے زیادہ سمجھدار تھا۔ اس نے چڑیوں سے کہا "عقل سے کام لو اور اس پودے کو بڑا ہونے سے پہلے اکھاڑ کر پھینک دو، یہ پودا جوان ہو کر برگد کا درخت بن جائے گا۔ اس کی شاخوں سے ایک طرح کا گوند نکلے گا، اس گوند سے آدمی لاسا تیار کر کے چڑیوں کو پکڑا کرے گا۔

چڑیوں نے اُلّو کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ وہ اسی طرح ہنسی خوشی گاتی ناچتی اور درختوں کی شاخوں پر پھدکتی رہیں۔ ادھر برگد کا پودا بڑھتا رہا، بڑھتا رہا۔ پھر آدمیوں نے سن اور جوٹ کے بیج بونے شروع کر دیے۔ چڑیوں نے اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا صرف اُلّو آنے والے خطرہ کو بھانپ گیا۔ اس نے چڑیوں سے کہا۔

"ان بیجوں کو جلدی جلدی چگ لو ورنہ ان سے سن پیدا ہوگا، پھر آدمی اس سن سے رسی اور ڈوریاں تیار کرے گا اور ان ڈوریوں سے چڑیوں کے پکڑنے کے لیے جال بنائے گا۔"

چڑیوں نے پھر اُلّو کی بات کو ہنسی میں اڑا دیا وہ اُسی طرح اپنے ناچ گانے میں لگی رہیں ادھر سن کا پودا بڑھتا رہا۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ آدمی جنگل میں آیا اس کے ہاتھ میں تیر اور کمان تھے اس بار پھر اُلّو نے چڑیوں کو آنے والے خطرہ کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا۔

"اپنے پروں کی حفاظت کرو ان کو زمین پر مت گرنے دو ورنہ یہ آدمی جو تمھارا جانی دشمن ہے ان کو اپنے تیروں میں لگائے گا اور پھر تمھاری خیر نہیں۔"

چڑیوں نے اُلّو کی یہ بات بھی نہ مانی اور اس کا خوب خوب مذاق اڑایا لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ بات ثابت ہوگئی کہ اُلّو نے جو کچھ کہا تھا وہی صحیح تھا۔ برگد کا درخت جوان ہو گیا اور اس کی شاخوں سے گوند نکلنے لگا۔ اس گوند سے آدمی نے لاسا تیار کر کے چڑیاں پکڑنا شروع کر دیں۔ سن کے پودے بڑھ کر پک گئے اور ان کے ریشوں سے ڈوریاں بنائی گئیں اور پھر چڑیوں کو پکڑنے کے لیے جال تیار کیے گئے۔ شکاری نے اپنے تیروں میں چڑیوں کے پر لگا لیے اور پھر چن چن کر چڑیوں کا شکار کرنے لگا۔

اب چڑیوں کو اپنی مصیبت کا احساس ہوا تو وہ بھاگی بھاگی اُلّو کے پاس گئیں لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی اور اب اُلّو کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

چڑیوں نے اُلّو کی بات نہ مانی تھی اس کا اُلّو کو بڑا دکھ تھا اور وہ جب ہی سے اداس ہے۔ وہ خاموش آنکھیں بند کیے کسی ٹہنی پر بیٹھا ہوا چڑیوں کی حالت پر افسوس کرتا رہتا ہے۔

□□□

فصیح الملک نواب مرزا خاں داغ دہلوی کی صد سالہ برسی کے موقعے پر قومی اردو کونسل کی جانب سے 31 جنوری 2006 کو ایوان غالب، ماتا سندری لین، نئی دہلی میں ایک یادگاری محفل کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمن فاروقی نے کی۔ جلسے میں جناب آنند موہن زتشی گلزار دہلوی نے کلیدی خطبہ اور جناب مخمور سعیدی نے داغ کے سوانحی کوائف پیش کیے۔ پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی بحیثیت مہمان خصوصی شریک محفل تھے۔ اس موقعے پر لی گئی ایک یادگار تصویر۔

شعبۂ اردو و فارسی، کرناٹک یونیورسٹی، دھارواڑ کی جانب سے 23 جنوری 2006 کو "تحریک آزادی میں اردو زبان و ادب کا حصہ" کے عنوان سے دو روزہ قومی اردو کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر تصویر میں شمع روشن کرتے ہوئے پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، ساتھ میں پروفیسر سید سجاد حسین، پروفیسر ایم خواجہ پیر، وائس چانسلر کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ، شری ایس شیو پرکاش رجسٹرار اور ڈاکٹر قدیر ناظم سرگروہ، صدر شعبۂ اردو کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ، دیکھے جاسکتے ہیں۔

RNI NO. 70323/99
DL - SW-15/4104/2006-8
Date of Publication:24/02/2006

URDU DUNIYA Monthly, March 2006, Vol. 8, Issue: 3
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

مجموعۂ نغز

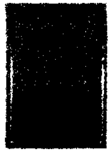

مصنف: قدرت اللہ قاسم

حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا یہ مشہور تذکرہ دو جلدوں میں تھا جسے فاضل مرتب پروفیسر محمود شیرانی نے یکجا کردیا ہے۔ پروفیسر شیرانی کا خیال ہے کہ محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آب حیات کا ایک اہم ماخذ یہ تذکرہ بھی ہے جس کا قلمی نسخہ انھیں آزاد کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوا۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات 492، قیمت -/268 روپے

عربی ادب کی تاریخ (تین جلدوں میں)

مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

مدارس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن اب تک اردو میں کوئی ایسی کتاب دستیاب نہیں تھی جس میں عربی ادب کی جامع اور مبسوط تاریخ بیان کی گئی ہو۔ ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی کی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ کتاب کی پہلی جلد میں زمانۂ جاہلیت، دوسری جلد میں حضرت محمدؐ کے عہد سے خلفائے راشدین کے عہد نیز اموی دور اور تیسری جلد میں عباسی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات: جلد اول: 352، جلد دوم: 390، جلد سوم: زیر طبع
قیمت: جلد اول: 86 روپے، جلد دوم: 91 روپے

لفظ

شاعر: آل احمد سرور

پروفیسر آل احمد سرور کا شمار اردو کے دیدہ ور نقادوں میں ہوتا ہے مگر وہ ایک نغز گو شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری ماضی کے اکتسابات کی حامل، حال کے میلانات کی ترجمان اور مستقبل کے امکانات کی نقیب ہے۔ سرور صاحب کی زندگی میں ان کے تین شعری مجموعے "سلسبیل"، "ذوقِ جنوں" اور "خواب اور خلش" شائع ہوئے۔ "لفظ" ان کا آخری شعری مجموعہ ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/64 روپے

مقالاتِ مسعود

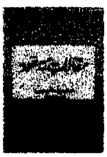

مصنف: مسعود حسین خاں

یہ کتاب ممتاز ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں کے سولہ علمی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اردو صوتیات، اقبال کا صوتی آہنگ، غالب کے خطوط کی لسانی اہمیت، اردو املا نویسی کے مسائل وغیرہ مختلف موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

صفحات: 230، قیمت: -/18.50 روپے

جدیدیت کی فلسفیانہ اساس

مصنف: پروفیسر شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کی اس کتاب میں جو جدیدیت اور نئے فکری اور فلسفیانہ میلانات کے سیاق میں حوالے کی حیثیت رکھتی ہے، جدیدیت اور مارکسیت سمیت ادب، زبان اور آرٹ سے تعلق رکھنے والے تمام اہم مکاتب فکر اور تصورات سے بحث کی گئی ہے۔ ادب میں قدیم و جدید کی کشمکش اور نئے طرز احساس و اظہار کے حوالے سے ایک اہم کتاب۔

صفحات 292، قیمت: -/114 روپے

نئی شعری روایت

مصنف: پروفیسر شمیم حنفی

اردو میں جب جدیدیت کے رجحان نے زور پکڑا اور اس وقت کے نئے لکھنے والوں میں اسے غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی تو اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے موافق اور مخالف دونوں طرح کی آرا کو سامنے رکھ کر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

صفحات 239، قیمت: -/96 روپے

قدیم اردو نظم

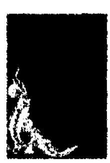

مرتب: ڈاکٹر فہمیدہ بیگم

اردو زبان اگرچہ شمالی ہند میں پیدا ہوئی لیکن اسے اعتبار و استحکام دکن میں حاصل ہوا چنانچہ نظم و نثر کے ابتدائی نمونے دکن میں ہی ملتے ہیں۔ قدیم ادبی تحقیقات کی تفہیم میں طلبا اور عام قارئین کو دقت ہوتی ہے۔ اس کتاب میں دکنی شعری ادب کے منتخب نمونے اعراب کے ساتھ دیے گئے ہیں اور حواشی میں مشکل الفاظ کے معنی بھی درج ہیں۔

صفحات 175، قیمت -/40 روپے

تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری

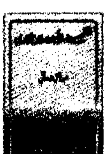

مصنف: عبدالغنی مدہوش

تعلیمی عمل میں رہنمائی کی بہت اہمیت ہے۔ مختلف مراحل پر طلبا کی بہتر رہنمائی اچھے کیریئر کی ضمانت ہے۔ اس کتاب میں ابتدائی اور ثانوی درجات کے علاوہ پیشہ ورانہ رہنمائی کی اہمیت بھی واضح کی گئی ہے۔

صفحات 192، قیمت: -/67 روپے

نوٹ :- طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Dr. R.K. Bhat, Principal Publication Officer, NCPUL on behalf of NCPUL,
Printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published from
NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor: Dr. R.K. Bhat, Tel : 26103381, 26103938.